امیر العظیم خصوصی نمبر

www.kashmirulyoum.com

کشمیری عوام کی امنگوں کا ترجمان

راولپنڈی

ماہنامہ

کشمیرالیوم

(رجسٹرڈ)

ABC CERTIFIED

Regd. No. 885, Mails, B/NPR-234

جلد نمبر-24......شمارہ نمبر-2......ماہ ستمبر 2026ء......ربیع الاوّل/ربیع الثانی ۱۴۴۸ھ

مردِ لازوال !

امام سیّد علی گیلانیؒ

ابن علی حسینؓ کے کردار پر فدا
درویش حُر مثال ، جو اب کے بچھڑ گیا
ہر وار سہہ لیا مگر بیعت کبھی نہ کی
تھا مردِ لازوال جو ، اب کے بچھڑ گیا

بہت عظیم تھے ہمارے

امیر العظیم ---!!!

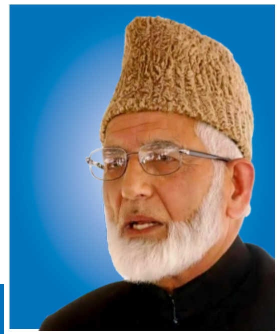

امام سیّد گیلانیؒ

سید صلاح الدین احمد (امیر حزب المجاہدین)

مزاحمت کا استعارہ، قائد تحریک آزادی جموں و کشمیر امام سید علی گیلانیؒ کی پوری زندگی اسلام کی سربلندی اور کشمیر کی آزادی کی عظیم جد و جہد میں گزری۔ سید نے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر امام حسن البناءؒ کی طرح، قوم کی امامت کا حق ادا کیا۔ باطل قوتوں کے خلاف زندگی کی آخری سانس تک پوری قوت سے مقابلہ کیا۔ نصف سے زائد زندگی بھارتی جیلوں میں گزاری اور زندگی کے آخری بارہ برسوں سے امام وقت بھارتی فورسز کے کڑے محاصرے میں اپنے گھر میں ہی مقید تھے۔ حراست کے دوران اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور اس طرح شہادت کا عظیم رتبہ حاصل کرتے ہوئے امر ہوگئے۔ قائد تحریک نے پوری کشمیری قوم کو اسلام کی سربلندی اور کشمیر کی بھارت سے آزادی کے لیے منظّم کیا اور تاریخ گواہ ہے کہ پوری قوم ہمت اور پامردی سے مقابلہ کر رہی ہے اور دنیا کو یہ پیغام دے رہی ہے کہ حصول منزل تک یہ جد وجہد جاری رہے گی۔ یہ جذبہ حریت پیدا کرنے میں امام سید گیلانیؒ کا کلیدی کردار ہے۔ بھارتی حکمرانوں کو اس قائد کی مقبولیت کا خوف اس حد تک سوار ہوچکا تھا کہ ان کی شہادت کے فوراً بعد پوری وادی میں کرفیو نافذ کیا گیا۔ فوج اور پولیس نے اہل خانہ پر شدید تشدد کرکے قائد انقلاب کے جسد خاکی کو اپنے قبضے میں لے کر اسے رات کی تاریکی میں حیدرپورہ قبرستان میں سپرد خاک کردیا۔ کم ظرفی اور بزدلی کی اس کے علاوہ کیا انتہا ہوسکتی ہے۔ سید گیلانیؒ نے اپنے کردار اور عمل سے لاکھوں گیلانی تیار کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقام پر فائز فرمائے۔ ان شاءاللہ حصول منزل تک ان کی برپا کی ہوئی تحریک جاری رہے گی۔

www.kashmirulyoum.com.pk

کشمیری عوام کی امنگوں کا ترجمان
راولپنڈی

ماہنامہ کشمیر الیوم

(رجسٹرڈ)

جلدنمبر-24......شمارہ نمبر-2......ماہ ستمبر 2026ء......ربیع الاوّل/ ربیع الثّانی ۱۴۴۸ھ

مجلس مشاورت

حامد میر

سید عارف بہار | راجہ ذاکر خان

سرور منیر راؤ | رُباب عائشہ | عاصم قدیر رانا

مدیرِ اعلیٰ : شیخ محمد امین

مدیر : فاروق احمد

نمائندگان

شمالی پنجاب : ارشد ایوب
آزاد جموں وکشمیر : غازی محمد اعظم
گلگت بلتستان : عبدالهادی بونجوی
سرینگر : سید مزمل حسین سہروردی
جموں : وجے کمار رینا
لداخ : جعفر حسین علوی
لندن : انوار الحق
نیویارک : فائزہ نذیر

ڈیزائننگ : عمر فاروق
کمپوزنگ :
منیجر فائنانس / سرکولیشن : شبیر یوسف
معاون سرکولیشن : طارق احمد

انچارج شعبہ اشتہارات : راجہ محمد شفیق

ویب انچارج : ڈاکٹر بلال احمد

اس شمارے میں

اداریہ	کیا مسافر تھے!	چیف ایڈیٹر کے قلم سے	03
شخصیات	مردِ لازوال۔۔۔امام سید علی گیلانی	شیخ محمد امین	04
شخصیات	سید علی گیلانی۔۔۔ایک شخص ایک کارروان	ابوہادیہ	06
خصوصی نمبر	امیر العظیم کہیئے یا امیر الاعظم کہیئے	خواجہ محمد شہباز	08
	ایک منفرد انسان، ایک محبوب قائد	شہباز بڈگامی	10
	سلاخیں بھی نہ جھکا سکیں جسے۔۔۔	سید عمر اویس گردیزی	12
	امیر بھی اور عظیم بھی	مجیب الرحمان شامی	14
	امیر العظیم بھی رُخصت ہوئے	خالد مسعود خان	15
	نظریے کا امین، استقامت کا استعارہ	میر بابر مشتاق	17
	امیر العظیم	آصف محمود	19
	امیر العظیم بھائی بھی داغِ مفارقت سے گئے	محمد شاہد شیخ	20
	امیر العظیم بہت یاد آؤ گے	محمد مہدی	22
	وہ نادر روزگار	ہارون الرشید	27
	امیر العظیم منصورہ کی بستی کا دھڑکتا ہوا دل	افشاں نوید	28
کشمیر کے شب وروز	مقبوضہ کشمیر کے مختلف علاقوں میں بھارتی فوج کے چھاپے	ہمایوں قیصر	31

ماہنامہ کشمیر الیوم میں شائع ہر کالم، کالم نگار کی ذاتی آراء پر مبنی ہوتا ہے،
جس سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں (چیف ایڈیٹر)

پبلشر : خواجہ محمد شہباز
مقامِ اشاعت : D-1005، سیٹلائیٹ ٹاؤن، راولپنڈی
مطبع : والضحیٰ پرنٹرز، قیصر پلازہ، صدر، راولپنڈی

Regd. No. 885
Mails. B/NPR-234

قیمت 50 روپے، سالانہ زرِ تعاون 500 روپے

خط وکتابت اور رابطہ کیلئے: دفتر ماہنامہ ''کشمیر الیوم'' NA/300-A نیو ملپور ڈبل روڈ راولپنڈی kashmirulyoum2019@gmail.com. 0318-5355344

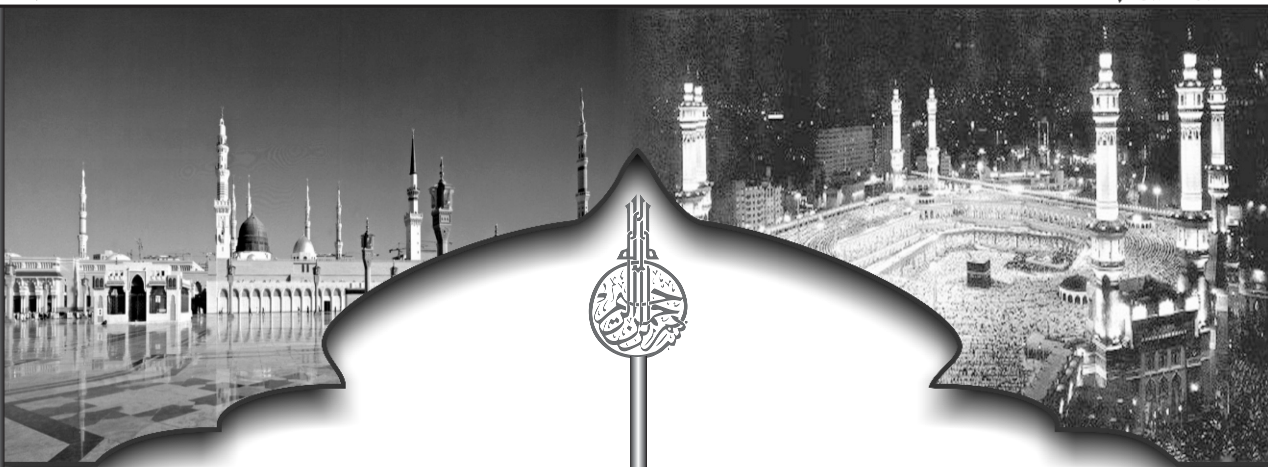

القرآن

کوئی قوم اپنے وقت مقرر سے پہلے ہلاک نہیں ہو سکتی !!!

ا۔ل ۔ر۔ یہ آیات ہیں کتاب الٰہی اور قرآن مبین کی ۔بعید نہیں کہ ایک وقت وہ آجائے جب وہی لوگ جنہوں نے آج (دعوت اسلام کو قبول کرنے سے) انکار کر دیا ہے، پچھتا پچھتا کر کہیں گے کہ کاش ہم نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہوتا ۔ چھوڑو انہیں ۔کھائیں پییں، مزے کریں اور بھلاوے میں ڈالے رکھے اُن کو جھوٹی امید ۔عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے، اس کے لیے ایک خاص مہلت عمل لکھی جا چکی تھی ۔کوئی قوم نہ اپنے وقت مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے، نہ اس کے بعد چھُوٹ سکتی ہے ۔

یہ لوگ کہتے ہیں: ’’اے وہ شخص جس پر ذکر نازل ہوا ہے، تو یقیناً دیوانہ ہے۔ اگر تو سچا ہے تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کیوں نہیں آتا؟‘‘ ۔ہم فرشتوں کو یوں ہی نہیں اتار دیا کرتے ۔وہ جب اترتے ہیں تو حق کے ساتھ اترتے ہیں، اور پھر لوگوں کو مہلت نہیں دی جاتی ۔رہا یہ ذکر، تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں ۔

اے محمدؐ! ہم تم سے پہلے بہت سی گزری ہوئی قوموں میں رسول بھیج چکے ہیں ۔کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کے پاس کوئی رسول آیا ہو اور انہوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو۔ مجرمین کے دلوں میں تو ہم اس ذکر کو اسی طرح (سلاخ کے مانند) گزارتے ہیں ۔وہ اس پر ایمان نہیں لایا کرتے ۔قدیم سے اس قماش کے لوگوں کا یہی طریقہ چلا آرہا ہے ۔

(سورہ الحجر 1 تا 13 تفہیم القرآن سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

الحدیث

پڑوسیوں کے حقوق !!!

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا : پڑوسی تین قسم کے اور تین درجے کے ہوتے ہیں ایک وہ پڑوسی جس کا صرف ایک ہی حق ہو اور وہ (حق کے لحاظ سے) سب سے کم درجہ کا پڑوسی ہے، اور دوسرا وہ پڑوسی جس کے دو حق ہوں اور تیسرا وہ جس کے تین حق ہوں ۔تو ایک حق والا وہ مشرک (غیر مسلم) پڑوسی ہے جس سے کوئی رشتہ داری بھی نہ ہو (تو اس کا صرف پڑوسی ہونے کا حق ہے) اور دو حق والا وہ پڑوسی ہے، جو پڑوسی ہونے کے ساتھ مسلم (یعنی دینی بھائی) بھی ہو، اس کا ایک حق مسلمان ہونے کی وجہ سے ہوگا اور دوسرا پڑوسی ہونے کی وجہ سے اور تین حق والا پڑوسی وہ ہے، جو پڑوسی بھی ہو، مسلم بھی ہو اور رشتہ دار بھی ہو۔تو اس کا ایک حق مسلمان ہونے کا ہوگا دوسرا حق پڑوسی ہونے کا اور تیسرا رشتہ داری کا ہوگا۔ (مسند بزار، حلیہ ابی نعیم)

تشریح: اس حدیث میں صراحت اور وضاحت فرمادی گئی ہے کہ پڑوسیوں کے جو حقوق قرآن وحدیث میں بیان فرمائے گئے اور ان کے اکرام اور رعایت و حسنِ سلوک کی جو تاکید فرمائی گئی ہے ان میں غیر مسلم پڑوسی بھی شامل ہیں اور ان کے بھی وہ سب حقوق ہیں ۔

کیا مسافر تھے جو اس راہ گزر سے گزرے!!!

22 جولائی 2026ء کو امیر العظیم اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے، اور یکم ستمبر 2021ء کو امام سید علی شاہ گیلانیؒ نے مقبوضہ کشمیر میں، زیر حراست علالت کے دوران اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ بظاہر دونوں شخصیات کی جدوجہد کے میدان مختلف تھے۔ ایک پاکستان میں اسلامی تحریک کا سرگرم کارکن، تنظیمی رہنما اور جماعت اسلامی پاکستان کا مرکزی سیکرٹری جنرل تھا جبکہ دوسرا کشمیر کی تحریک آزادی کا مرد حر اور مزاحمت کی علامت۔ مگر دونوں کے درمیان ایک گہری قدر مشترک موجود تھی۔ نظریئے سے وفا، مقصد سے وابستگی اور آزمائش کے وقت استقامت۔ امیر العظیم کی زندگی کسی عہدے یا منصب کی کہانی نہیں بلکہ کارکن سے قائد بننے کے ایک مسلسل سفر کی داستان تھی۔ طالب علمی اور طلبہ سیاست سے عملی جدوجہد کا آغاز، تحریک کے مختلف مراحل، قید و بند کی صعوبتیں، تنظیمی ذمہ داریاں، مرکزی ترجمانی اور پھر جماعت اسلامی پاکستان کے مرکزی سیکرٹری جنرل کی ذمہ داری، یہ تمام منازل اس بات کی گواہ ہیں کہ انہوں نے سیاست کو محض اقتدار کا وسیلہ نہیں سمجھا۔ ان کے لیے تنظیم ایک امانت اور کارکن ہونا ایک اعزاز تھا۔ بیماری اور کمزوری کے آخری ایام میں بھی ذمہ داری کا احساس ان کے ساتھ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات صرف ایک تنظیمی عہدے دار کی وفات نہیں، بلکہ ایک ایسے سیاسی کارکن کی رخصتی تھی جس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ نظریاتی وابستگی کے نام کر دیا۔ امام سید علی گیلانیؒ بھی اسی قبیل کے مرد تھے۔ ان کی پوری زندگی غلبہ اسلام اور آزادی کشمیر کی جدوجہد میں گزری۔ جیلیں، نظربندیاں، پابندیاں، مقدمات، سیاسی دباؤ، بڑھتی عمر اور بیماری، کوئی آزمائش انہیں اپنے موقف سے پیچھے نہ ہٹا سکی۔ ان کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہی تھی کہ انہوں نے حالات کے بدلتے ہوئے موسموں کے ساتھ اپنے اصولوں کو تبدیل نہیں کیا۔ ان کی شخصیت کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی تدفین کے حوالے سے پیدا ہونے والی صورت حال نے یہ تاثر مزید گہرا کیا کہ باطل اور قابض قوتوں کا ان کی شخصیت سے خوف ان کی زندگی تک محدود نہیں تھا۔ لیکن تاریخ کا اپنا ایک فیصلہ ہوتا ہے۔ جسم کو پابندیوں میں رکھا جا سکتا ہے، قبر کو لوگوں سے دور کیا جا سکتا ہے، آواز کو خاموش کیا جا سکتا ہے، مگر ایک ایسے شخص کے نظریئے کو دفن نہیں کیا جا سکتا جس نے اپنی پوری زندگی اسی نظریئے کی قیمت ادا کرتے ہوئے گزاری ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں امیر العظیمؒ اور سید علی گیلانیؒ ایک دوسرے کے قریب دکھائی دیتے ہیں۔ دونوں نے اپنی اپنی سطح پر شخصیت سے زیادہ نظریے، مفاد سے زیادہ مقصد اور منصب سے زیادہ ذمہ داری کو اہمیت دی۔ دونوں کی زندگیوں میں کارکن کا تصور نمایاں تھا۔ فرق صرف میدان کا تھا۔ ایک نے پاکستان میں اسلامی تحریک کی تنظیمی اور فکری جدوجہد کو اپنا میدان بنایا، دوسرے نے کشمیر میں اپنی قوم کے سیاسی مستقبل کے لیے مزاحمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ امیر العظیم سید علی گیلانیؒ کے مداح تھے۔ یہ محض کسی شخصیت سے عقیدت کا معاملہ نہیں تھا۔ شاید انہیں امام گیلانیؒ کی شخصیت میں وہی چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی تھی جو خود ان کی اپنی زندگی کا بھی نمایاں وصف تھی یعنی حق کیلئے ڈٹ جانا۔ ایسے وقت میں جب سیاست میں نظریاتی وابستگی اکثر وقتی مصلحتوں کے سامنے کمزور پڑ جاتی ہے، امام گیلانیؒ کی استقامت اور امیر العظیم کی تنظیمی وفا دونوں اپنے اندر ایک سبق رکھتے ہیں۔ یہ خصوصی شمارہ اگرچہ امام سید علی گیلانیؒ کے روحانی شاگرد سے منسوب ہے، لیکن یکم ستمبر، ان کے یوم وفات کے موقع پر خود امام گیلانیؒ کا ذکر نہ کرنا اس شمارے کے ساتھ ناانصافی ہوتی۔ شاگرد کی نسبت اپنی جگہ محترم ہے، مگر روحانی اور فکری نسبت کی اصل بنیاد وہ شخصیت ہوتی ہے جس کے کردار، فکر اور عمل سے شاگرد روشنی حاصل کرتا ہے۔ اس لیے یہ شمارہ دراصل استاد اور شاگرد، فکر اور عمل، ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک فکری ربط بھی ہے۔ سید علی گیلانیؒ کو صرف کشمیر کے ایک سیاسی رہنما کے طور پر دیکھنا ان کی شخصیت کو محدود کرنا ہوگا۔ وہ ایک ایسے عہد کی علامت بن چکے ہیں جس میں نظریاتی سیاست کے لیے قیمت ادا کرنا پڑتی تھی۔ امیر العظیمؒ اب ہمارے درمیان نہیں اور امام سید علی گیلانیؒ بھی ہم سے رخصت ہو چکے ہیں۔ مگر بعض لوگ رخصت ہو کر ختم نہیں ہوتے۔ وہ اپنے کردار، اپنی جدوجہد اور اپنے سوالات کے ذریعے زندہ رہتے ہیں۔ ایک نے تنظیمی وفا کی مثال چھوڑی، دوسرے نے مزاحمت میں بے مثال استقامت دکھائی۔ ایک نے کارکن کی زندگی کو عزت دی، دوسرے نے قید و بند کے باوجود اپنے موقف کی حفاظت کی۔ یہ دونوں مردان وفا ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ انسان کا اصل قد اس منصب سے نہیں جس پر وہ فائز ہو، بلکہ اس اصول سے متعین ہوتا ہے جس پر وہ آخری دم تک قائم رہتا ہے۔ کیا مسافر تھے جو اس راہ گزر سے گزرے۔ آج جب یکم ستمبر ہمیں سید علی گیلانیؒ کی یاد دلاتا ہے اور امیر العظیم کی تازہ رخصتی ہمارے دلوں میں ان کی یاد تازہ کئے ہوئے ہے، تو ضرورت صرف تعزیتی کلمات دہرانے کی نہیں، بلکہ ان دونوں شخصیات کے چھوڑے ہوئے اخلاقی اور نظریاتی میراث پر غور کرنے کی ہے۔

مردِ لازوال---
امام سیّد علی گیلانیؒ

شیخ محمد امین

کچھ شخصیات صرف اپنی زندگی نہیں گزارتیں، بلکہ ایک عہد کی ترجمانی کرتی ہیں۔ وہ وقت کے دھارے میں گم نہیں ہوتیں، بلکہ تاریخ کے صفحات پر اپنے عزم، نظریے اور جدوجہد کے ایسے نقوش چھوڑ جاتی ہیں جنہیں مٹانا آسان نہیں ہوتا۔ امام سید علی شاہ گیلانی ؒ بھی کشمیر کی سیاسی اور مزاحمتی تاریخ کی ایسی ہی ایک شخصیت تھے، جنہوں نے اپنی پوری زندگی اپنے نظریے، اپنے موٴقف اور کشمیری عوام کے حق خودارادیت کے لیے وقف کر دی۔ یکم ستمبر 2021ء کو 92 برس کی عمر میں جب امام سید علی گیلانی ؒ نے طویل علالت کے بعد اس دنیا سے رخصت لی تو کشمیر کی مزاحمتی سیاست کا ایک اہم باب اختتام پذیر ہوا، لیکن ان کی آواز، ان کا نظریہ اور ان کی جدوجہد کشمیر کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی یاد بن گئی۔

امام سید علی گیلانی ؒ کی زندگی کا ایک بڑا حصہ قید و بند کی صعوبتوں میں گزرا۔ جیل کی سلاخیں ان کے لیے نئی نہیں تھیں۔ پابندیاں، نظربندی، گرفتاریاں اور سیاسی دباؤ ان کی زندگی کا مستقل حصہ رہے۔ جسم کو قید کیا جا سکتا تھا، فکر کو نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ قید کے دوران بھی ان کا قلم خاموش نہ ہوا۔ انہوں نے دو جلدوں پر مشتمل اپنی معروف کتاب ”رودادِ قفس“، تحریکی، جبکہ سیاسی، سماجی، مذہبی اور فکری موضوعات پر سینکڑوں مضامین اور متعدد کتابچے بھی لکھے۔ وہ صرف سیاست دان نہیں تھے۔ وہ ایک صاحب قلم مصنف، شعلہ بیان مقرر، مذہبی فکر رکھنے والے رہنما اور اپنے نظریے پر غیر معمولی استقامت کے حامل قائد تھے۔

امام سید علی گیلانی ؒ 29 ستمبر 1929ء کو ضلع بارہمولہ میں جھیل وُلر کے کنارے آباد گاؤں زوری منز کے ایک معزز سید گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سوپور میں حاصل کی اور بعد ازاں لاہور کے اورینٹل کالج سے تعلیم مکمل کی لیکن ان کی اصل شناخت کسی تعلیمی سند سے نہیں، بلکہ اس سیاسی سفر سے بنی جو انہیں کشمیر کی مزاحمتی سیاست کے مرکز تک لے گیا۔ انہوں نے 1950ء میں کشمیریوں کی سیاسی مزاحمت میں عملی طور پر حصہ لے کر اپنے سیاسی سفر کا آغاز کیا۔ امام سید علی گیلانی ؒ کی فکری تشکیل پر علامہ محمد اقبال ؒ اور امام سید ابوالاعلیٰ مودودی ؒ کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ اقبال ؒ نے انہیں خودی، حریت فکر، عزت نفس اور غلامی کے خلاف مزاحمت کا شعور دیا، جبکہ سید مودودی ؒ کی فکر نے اسلام کو محض ایک مذہبی عقیدے کے بجائے ایک مکمل ضابطہ حیات اور اجتماعی جدوجہد کے طور پر سمجھنے میں ان کی رہنمائی کی۔ امام گیلانی ؒ علامہ اقبال ؒ کے اس پیغام سے خاص طور پر متاثر دکھائی دیتے تھے کہ مسلمان اپنے اندر خود اعتمادی، غیرت اور آزادی کی روح پیدا کرے، جبکہ امام مودودی ؒ کی تحریروں اور فکری جدوجہد نے ان کے سیاسی اور اسلامی نظریۂ حیات کو مزید واضح کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سیاست میں علامہ اقبال ؒ کی خودی و حریت اور امام سید مودودی ؒ کی اسلامی فکر و عملی جدوجہد کا امتزاج نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ان عظیم قائدین کے نظریات کو آگے بڑھانے کیلئے وہ جماعت اسلامی جموں و کشمیر سے وابستہ ہوئے اور بتدریج اس کے نمایاں رہنماؤں میں شمار ہونے لگے۔ ان کی دینی و سیاسی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں پہلی مرتبہ 1964ء میں گرفتار کیا گیا۔ اس کے بعد قید و بند جیسے ان کی زندگی کا لازمی جزو بن گیا۔ مگر ہر گرفتاری کے بعد وہ پہلے سے زیادہ پرعزم ہو کر سامنے آتے رہے۔ اسمبلی سے مزاحمت کی قیادت تک امام سید علی گیلانی ؒ تین مرتبہ مقبوضہ کشمیر کی اسمبلی کے رکن بھی رہے۔ یہ ان کی سیاسی زندگی کا ایک اہم پہلو تھا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان کی شناخت انتخابی سیاست سے زیادہ کشمیری مزاحمتی تحریک کے ایک مستقل مزاج رہنما کے طور پر بن گئی۔ وہ آل پارٹیز حریت کانفرنس کے چیئرمین بھی رہے۔

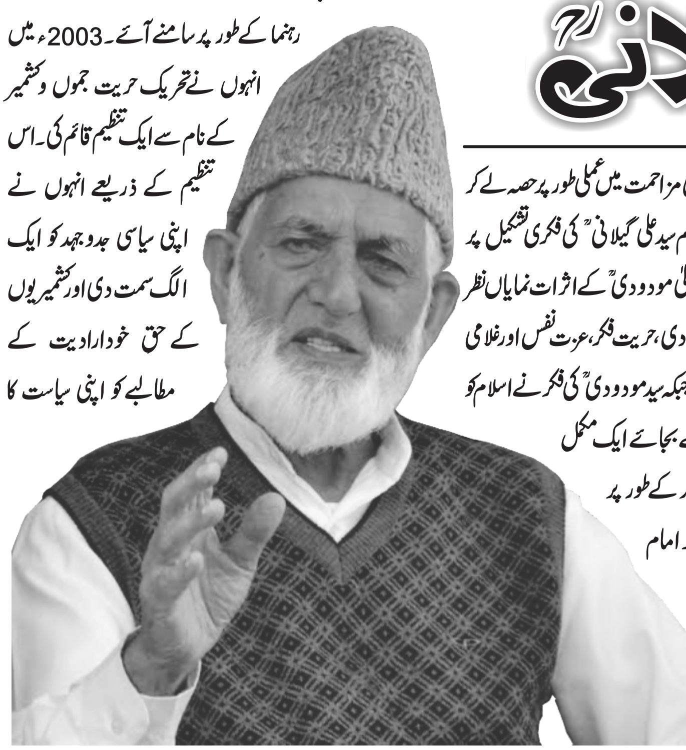

امام سید گیلانی ؒ کا بنیادی موٴقف واضح تھا کہ مسئلہ کشمیر کا حل کشمیری عوام کی خواہشات، تاریخی پس منظر اور اقوام متحدہ کی متعلقہ قراردادوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ اسی موٴقف کی وجہ سے وہ مقبوضہ کشمیر میں پاکستان کے ساتھ الحاق کے حامی نمایاں کشمیری رہنما کے طور پر سامنے آئے۔ 2003ء میں انہوں نے تحریک حریت جموں و کشمیر کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اس تنظیم کے ذریعے انہوں نے اپنی سیاسی جدوجہد کو ایک الگ سمت دی اور کشمیریوں کے حق خودارادیت کے مطالبے کو اپنی سیاست کا بنیادی محور بنائے رکھا۔ مشرف فارمولے سے اختلاف امام سید گیلانی ؒ کی سیاسی زندگی کا ایک نمایاں پہلو ان کی اصولی سیاست تھی۔ 2003ء میں جب پاکستان کے اس وقت کے صدر جنرل پرویز مشرف کی جانب سے مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے اقوام متحدہ کی قراردادوں سے ہٹ کر چار نکاتی فارمولہ کے تحت مسئلہ کشمیر کو حل (تحلیل) کرنے کی کوشش کی گئی تو امام سید گیلانی ؒ نے اس کی کھل کر مخالفت کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسئلہ کشمیر کا کوئی بھی حل کشمیری عوام کی خواہشات کو نظرانداز کر کے نہیں نکالا جا سکتا۔ اسی اختلاف نے کشمیری مزاحمتی قیادت کے اندر موجود سیاسی خلیج کو مزید نمایاں کیا اور حریت کانفرنس مختلف دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ امام سید گیلانی اپنے موٴقف سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں ان کی شخصیت نے ایک ایسے رہنما کی شکل اختیار کی جس کے لیے سیاسی مصلحت سے زیادہ نظریاتی وابستگی اہم تھی۔ 29 جون 2020ء کو امام سید گیلانی ؒ نے آل پارٹیز حریت کانفرنس کے اس دھڑے سے بھی علیحدگی کا اعلان کیا جس کی وہ قیادت کر رہے تھے۔

عمر ڈھل چکی تھی، جسم بیماریوں سے کمزور ہو چکا تھا، مگر ان کے لہجے میں وہی یقین اور مزاحمتی جذبہ باقی تھا جس نے انہیں کئی دہائیوں تک کشمیر کی سیاست کا ایک نمایاں کردار بنائے رکھا۔ انہوں

نے اپنے آخری ایام میں کہا" جسمانی کمزوری اور مختلف عوارض، روح کے مضمحل ہونے کے مترادف نہیں ہے، نہ قلب و ذہن کی قوت موقوف ہوئی ہے اور نہ ہی میرے جذبۂ حریت میں کوئی ضعف آیا ہے۔ اس دارفانی سے رحلت تک میں بھارتی استعمار کے خلاف نبرد آزما رہوں گا اور اپنی قوم کی رہنمائی کا حق حسبِ استطاعت ادا کرتا رہوں گا"۔ یہ الفاظ دراصل ان کی پوری زندگی کا خلاصہ تھے۔ جسم کمزور ہوتا گیا، مگر عزم کمزور نہ ہوا۔ مارچ 2018ء میں سید گیلانی کی ایما پر ان کے دیرینہ ساتھی محمد اشرف صحرائیؒ کو تحریک حریت جموں وکشمیر کا امیر مقرر کیا گیا۔ صحرائی صاحبؒ 5 مئی 2021ء کو دوران حراست جموں کے ایک اسپتال میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔ جموں کشمیر میں امام سید گیلانیؒ کے سیاسی اثر و رسوخ کو سمجھنے کے لیے شیخ محمد عبداللہ کی تاریخ کو بھی سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ کشمیری عوام نے ایک زمانے میں شیخ عبداللہ سے بہت سی امیدیں وابستہ کی تھیں۔ لیکن 1975ء کے سیاسی سمجھوتے کے بعد یہ احساس پیدا ہوا کہ ان کی سابقہ سیاست اور بعد کی سیاست میں نمایاں فرق آگیا ہے۔ امام سید گیلانیؒ نے اس کے برعکس سمجھوتے سے گریز کی سیاست اختیار کی۔ اسی لئے لوگوں کو ان میں 1975ء سے پہلے کے شیخ عبداللہ کی مزاحمتی تصویر دکھائی دیتی تھی۔ ایک ایسا رہنما جو اپنے مؤقف پر قائم رہنے کے لیے اقتدار اور مراعات سے بھی دستبردار ہوسکتا ہے۔ یہی تصور ان کی عوامی مقبولیت کا ایک اہم سبب بنا۔ ایک قلم، ایک آواز سید علی گیلانی کو صرف ایک سیاسی رہنما کے طور پر دیکھنا شاید ان کی شخصیت کو محدود کرنا ہوگا۔ ان کا قلم بھی ان کی سیاست کی طرح مزاحمتی تھا۔ ان کی تحریروں میں مذہبی فکر، سیاسی شعور، کشمیر کی تاریخ اور آزادی کے تصور کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے تھے۔ جیل ان کے لئے صرف قید خانہ نہیں تھی وہ اسے مطالعے، غور و فکر اور تحریر کی جگہ بھی بنالیتے تھے۔ ان کی خطابت میں جوش تھا، تحریر میں استدلال تھا اور سیاسی مؤقف میں غیر معمولی سختی۔ یہی امتزاج انہیں کشمیر کی مزاحمتی سیاست میں ایک منفرد مقام دیتا ہے۔

2020ء میں حکومت پاکستان نے امام سید علی گیلانیؒ کو ملک کے اعلیٰ ترین سول اعزاز نشان پاکستان سے نوازا۔ یہ اعزاز ان کی طویل سیاسی جدو جہد، ثابت قدمی اور کشمیر کے بارے میں ان کے دیرینہ مؤقف کے اعتراف کے طور پر دیکھا گیا۔ تاہم اس وقت تک ان کی صحت بری طرح متاثر ہو چکی تھی۔ برسوں کی نظر بندی، مسلسل بیماری، جسمانی کمزوری اور عمر کے آخری حصے کی مشکلات نے اگرچہ ان کے جسم کو ناتواں کر دیا تھا، مگر ان کے عزم، حوصلے اور نظریئے کو متزلزل نہ کرسکیں۔

پھر وہ صبح بھی آپہنچی جس نے کشمیر کی مزاحمتی سیاست کے اس بزرگ کردار کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔ یکم ستمبر 2021ء کو سید علی گیلانیؒ طویل علالت کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ زندگی کے آخری ایام بھی انہوں نے نظر بندی اور سخت پابندیوں کے سائے میں گزارے۔ یوں ان کی زندگی کا اختتام بھی اسی جدو جہد کی فضا میں ہوا جس میں ان کی پوری زندگی گزری تھی۔

ان کی حسینی وفا اور استقامت کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوسکتی ہے کہ ان کی شہادت کے بعد بھی ان کے جسد خاکی کو سکون سے نہ رہنے دیا گیا۔ ان کی میت کو رات کی تاریکی میں اہل خانہ سے چھین کر، گھسیٹ کر اور عام لوگوں سے دور لے جا کر حیدر پورہ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ شاید اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھنے والوں کا خیال تھا کہ ایک بزرگ مزاحمتی رہنما کے جسد خاکی کو تنہائی میں دفن کر کے اس کی یاد اور اثرات کو بھی مٹا دیا جائے گا، مگر وہ یہ حقیقت بھول گئے کہ حسینی انداز میں رخصت ہونا عبرت نہیں، عزت اور استقامت کی علامت ہوتا ہے۔

سید علی گیلانیؒ کی شخصیت کو مختلف زاویوں سے دیکھا گیا۔ کسی کے لیے وہ ایک سخت گیر علیحدگی پسند رہنما تھے، کسی کے لیے پاکستان سے الحاق کے سب سے مضبوط اور واضح حامی، کسی کے لیے مزاحمتی سیاست کی علامت، اور کسی کے لیے اصولوں پر آخری دم تک قائم رہنے والے ایسے قائد جنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ قید، نظر بندی، مشکلات اور سیاسی جدو جہد میں گزار دیا۔ مگر تاریخ کے صفحات میں ان کی سب سے نمایاں شناخت شاید یہی رہے گی کہ انہوں نے اپنے مؤقف کو وقت کے بدلتے ہوئے موسموں کے ساتھ تبدیل نہیں کیا۔ حالات بدلے، سیاسی منظرنامے بدلے، اقتدار کے مراکز بدلے، مگر سید علی گیلانیؒ کے مؤقف میں تبدیلی نہ آئی۔ وہ جیل گئے، نظر بند ہوئے، پابندیوں کا سامنا کیا، بیماریوں نے گھیر لیا، جسمانی قوت جواب دینے لگی اور عمر نے بھی اپنا اثر دکھایا، لیکن ان کی آواز میں آخری لمحے تک وہی یقین، وہی عزم اور وہی استقامت برقرار رہی۔ ان کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ نظریات جسم سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ جسم کمزور ہوسکتا ہے، قدم رک سکتے ہیں، زبان خاموش ہوسکتی ہے، مگر اگر کسی انسان کے اندر کوئی نظریہ پوری قوت کے ساتھ زندہ ہو تو اس کی آواز سلاخوں، دیواروں اور سرحدوں سے گزر کر آنے والی نسلوں تک پہنچتی رہتی ہے۔ امام سید علی گیلانیؒ کی زندگی جدو جہد، قربانی، استقامت اور اپنے مؤقف پر ثابت قدم رہنے کی ایک طویل داستان ہے۔ ان کا سفر اختتام پذیر ضرور ہوا، مگر ان کی فکر، ان کے نعرے اور ان کی جدو جہد کی بازگشت تاریخ کے اوراق میں دیر تک سنائی دیتی رہے گی۔

سلام امام سید علی گیلانیؒ! سلام اے مرد لازوال! سلام اے مرد استقامت!۔۔۔ آپ نے وقت کے سامنے جھکنے کے بجائے وقت کے سینے پر اپنے عزم کی داستان رقم کر دی۔

> عمر ڈھل چکی تھی، جسم بیماریوں سے کمزور ہو چکا تھا، مگر ان کے لہجے میں وہی یقین اور مزاحمتی جذبہ باقی تھا جس نے انہیں کئی دہائیوں تک کشمیر کی سیاست کا ایک نمایاں کردار بنائے رکھا۔ انہوں نے اپنے آخری ایام میں کہا" جسمانی کمزوری اور مختلف عوارض، روح کے مضمحل ہونے کے مترادف نہیں ہے، نہ قلب و ذہن کی قوت موقوف ہوئی ہے اور نہ ہی میرے جذبۂ حریت میں کوئی ضعف آیا ہے۔ اس دارفانی سے رحلت تک میں بھارتی استعمار کے خلاف نبرد آزما رہوں گا اور اپنی قوم کی رہنمائی کا حق حسبِ استطاعت ادا کرتا رہوں گا"۔

سید علی گیلانیؒ۔۔۔ایک شخص ایک کارواں

ابو ہادیہ

سید علی گیلانیؒ محض ایک فرد، سیاسی رہنما یا حریت فکر کا نام نہیں بلکہ کشمیری عوام کی مزاحمت، حق خودارادیت اور بھارتی قبضے کے خلاف غیر متزلزل جدوجہد کی ایک پوری تاریخ کا نام ہے۔ یکم ستمبر 2021 کو حیدر پورہ سرینگر میں ان کے انتقال کو پانچ برس مکمل ہو رہے ہیں، لیکن ان کی شخصیت، نظریات، سیاسی جدوجہد اور قربانیوں کی بازگشت آج بھی مقبوضہ جموں وکشمیر کے طول وعرض میں سنائی دیتی ہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اپنے عوام کے حق خودارادیت کیلئے وقف کی اور آخری سانس تک اپنے مؤقف پر ثابت قدم رہے۔ سید علی گیلانیؒ 29 ستمبر 1929 کو شمالی کشمیر کے ضلع بانڈی پورہ میں پیدا ہوئے۔ بعدازاں ان کا خاندان سوپور منتقل ہوگیا۔ انہوں نے اورینٹل کالج لاہور سے ادیب عالم جبکہ کشمیر یونیورسٹی سے ادیب فاضل اور منشی فاضل کی اسناد حاصل کیں۔ 1949 میں بحیثیت استاد عملی زندگی کا آغاز کیا اور تقریباً بارہ برس تک مقبوضہ کشمیر کے مختلف تعلیمی اداروں میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ مذہبی اور دنیاوی تعلیم کے امتزاج نے ان کی شخصیت کو ایک منفرد فکری بنیاد فراہم کی، جس کا اثر ان کی پوری زندگی اور سیاسی جدوجہد میں نمایاں رہا۔

سید علی گیلانی کم عمری ہی سے جماعت اسلامی جموں وکشمیر سے وابستہ ہوگئے اور 1953 میں جماعت کے رکن بنے۔ انہوں نے مختلف تنظیمی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے قائم مقام امیر جماعت اسلامی تک کا منصب سنبھالا۔ ان کی سیاسی زندگی کا ایک بڑا حصہ بھارتی حکمرانوں کی جانب سے گرفتاریوں، قید وبند اور پابندیوں میں گزرا۔ وہ پہلی مرتبہ 28 اگست 1962 کو گرفتار ہوئے اور تیرہ ماہ بعد انہیں رہائی ملی۔ مجموعی طور پر انہوں نے اپنی زندگی کے چودہ برس سے زائد عرصہ مقبوضہ جموں وکشمیر اور بھارت کی مختلف جیلوں میں گزارا، جبکہ آخری ایام میں انہیں بارہ برسوں کے طویل عرصے تک اپنے گھر میں نظربند رکھا گیا۔ وہ مقبوضہ جموں وکشمیر کی قانون ساز اسمبلی کے رکن بھی رہے اور 1972، 1977 اور 1987 میں حلقہ سوپور سے جماعت اسلامی کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے۔ تاہم 30 اگست 1989 کو انہوں نے اسمبلی کی رکنیت سے ہمیشہ کیلئے استعفیٰ دے دیا۔ ان کے نزدیک مسئلہ کشمیر محض انتخابی سیاست کا معاملہ نہیں بلکہ ایک بنیادی قومی اور انسانی مسئلہ تھا، جس کا حل کشمیری عوام کے حق خودارادیت کے اصول کے مطابق ہونا چاہیے۔

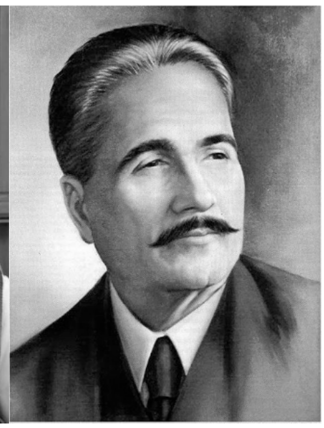

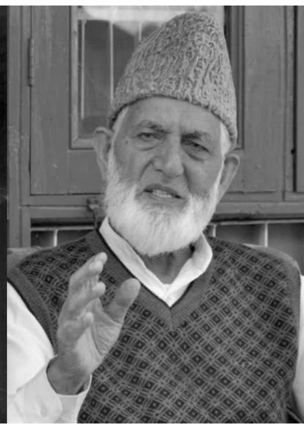

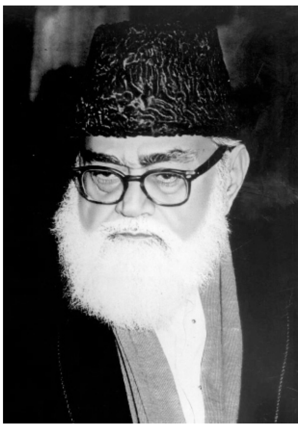

سید علی گیلانیؒ کا سیاسی مؤقف ہمیشہ واضح، دوٹوک اور غیر متزلزل رہا۔ وہ مقبوضہ جموں وکشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے پرزور حامی تھے اور ان کا مشہور نعرہ "ہم پاکستانی ہیں، پاکستان ہمارا ہے"، کشمیری عوام میں ایک معروف سیاسی نعرے کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ان کے نزدیک مقبوضہ جموں وکشمیر کی مذہبی، تہذیبی، تاریخی، جغرافیائی اور معاشرتی وابستگیاں پاکستان کے ساتھ گہری تھیں۔ اسی مؤقف کی بنیاد پر انہوں نے بھارت کے زیر تسلط جموں وکشمیر کو ایک متنازعہ خطہ قرار دیتے ہوئے کشمیری عوام کے حق خودارادیت کے حصول کو اپنی زندگی کا بنیادی مقصد بنایا۔ 7 اگست 2004 کو انہوں نے اپنی سیاسی جماعت تحریک حریت جموں وکشمیر قائم کی اور اس کے پہلے سربراہ منتخب ہوئے۔ بعدازاں 19 مارچ 2018 کو انہوں نے اپنی زندگی ہی میں محمد اشرف خان صحرائی کو تحریک حریت کی قیادت سونپ دی۔ اس سے قبل وہ کل جماعتی حریت کانفرنس کے تاحیات چیئرمین بھی رہے۔ تاہم 29 جون 2020 کو انہوں نے ناگزیر وجوہات کی بنا پر کل جماعتی حریت کانفرنس سے علیحدگی اختیار کرلی۔ ان کی سیاسی زندگی کا یہ سفر اس بات کا عکاس تھا کہ وہ تنظیمی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر اپنے بنیادی نظریے پر قائم رہے۔

سید علی گیلانیؒ صرف میدان سیاست کے شہکار نہیں تھے۔ وہ علم و ادب سے گہرا شغف رکھنے والی صاحب مطالعہ شخصیت تھے اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ اپنی اسیری کے تجربات کو انہوں نے "رودادِ قفس" جیسی تصنیف میں محفوظ کیا۔ قرآن وحدیث، سیرت اور اسلامی فکر پر ان کی گفتگو میں گہری علمی بصیرت دکھائی دیتی تھی، جبکہ شاعر مشرق علامہ محمد اقبال سے ان کی خصوصی عقیدت معروف تھی۔ وہ معروف عالمی اسلامی فورم رابطہ عالم اسلامی کے رکن بننے والے اولین کشمیری حریت رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ بیماری، قید اور پابندیوں کے باوجود جدوجہد میں گزرا۔ انہیں مختلف جسمانی عوارض کا سامنا رہا، مگر بیماری اور بڑھتی عمر بھی ان کے عزم کو متزلزل نہ کرسکی۔ بھارتی حکومت نے انہیں طویل عرصے تک گھر میں نظربند رکھا، ان کی سیاسی وسماجی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کیں اور انہیں بنیادی حقوق سے محرومی کا سامنا رہا۔ اس طویل قید کے دوران بھی ان کا سیاسی مؤقف تبدیل نہ ہوا۔ ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو یہی تھا کہ وہ سمجھوتے کے بجائے اپنے اصولوں پر قائم رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔

ان کی ثابت قدمی کا اعتراف ان کے سیاسی مخالفین بھی کرتے تھے۔فاروق عبداللہ کا ایک بھارتی ٹی وی چینل کو دیا گیا بیان اس حوالے سے قابل ذکر ہے جس میں انہوں نے اختلافات کے باوجود اس امر کا اعتراف کیا کہ سید علی گیلانیؒ کے نظریات کو پیسے کے ذریعے تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ یہی استقلال ان کی سیاسی شخصیت کی سب سے بڑی پہچان تھا۔سید علی گیلانی کی جدوجہد کو عالمی سطح پر بھی توجہ حاصل ہوئی۔حکومت پاکستان نے 14 اگست 2020 کو انہیں ملک کے اعلیٰ ترین سول اعزاز نشانِ پاکستان سے نوازا۔یہ اعزاز ان کی طویل سیاسی جدوجہد اور مسئلہ کشمیر پر ان کے نمایاں کردار کے ریاستی سطح پر اعتراف کی علامت سمجھا گیا۔

یکم ستمبر 2021 کو سید علی گیلانیؒ حیدرپورہ سرینگر میں اپنی رہائش گاہ پر انتقال کر گئے۔ان کے انتقال سے قبل طویل عرصے تک گھر میں نظربندی نے ان کی صحت کو شدید متاثر کیا تھا۔ان کے انتقال کے بعد قابض بھارتی حکام کی جانب سے ان کی تدفین کے انتظامات اور اہل خانہ کے ساتھ سفاکانہ برتاؤ پر بھی شدید تنقید سامنے آئی۔ان کے خاندان اور حامیوں کے مطابق ان کی خواہش تھی کہ انہیں مزارِ شہدا، سرینگر میں سپردِ خاک کیا جائے، تاہم ان کی میت کو بھارتی درندوں نے اپنی تحویل میں لے کر حیدرپورہ میں رات کی تاریکی میں تدفین کر دی۔ یوں ایک ایسے رہنما کے آخری سفر پر بھی پابندیاں عائد کی گئیں جس نے اپنی زندگی بھر کشمیری عوام کے سیاسی حقوق کیلئے جدوجہد کی تھی۔سید علی گیلانیؒ نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں بھارتی پالیسیوں، آبادیاتی تبدیلی اور مقبوضہ جموں وکشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کرنے کے ممکنہ نتائج کے حوالے سے بارہا خبردار کیا تھا۔ 5 اگست 2019 کو بھارت کی جانب سے جموں وکشمیر کی خصوصی آئینی حیثیت ختم کیے جانے اور اس کے بعد غیر ریاستی باشندوں کو ڈومیسائل فراہم کرنے کی پالیسیوں نے ان خدشات کو مزید نمایاں کر دیا۔ان کے نزدیک آبادی کے تناسب اور شناخت میں تبدیلی مسئلہ کشمیر کی بنیادی نوعیت کو متاثر کرنے کی کوشش تھی۔ان کی سیاسی جدوجہد کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ طاقت، جبر اور فوجی دباؤ کسی قوم کے سیاسی ارادے کو مستقل طور پر ختم نہیں کرسکتے۔ اسی لیے وہ گرفتاریوں، نظربندیوں، چھاپوں اور پابندیوں کے باوجود اپنے نظریے سے پیچھے نہیں ہٹے۔وہ اکثر بھارتی فوجیوں اور قابض حکام کو مخاطب کرتے ہوئے سوال اٹھاتے تھے کہ وہ ایک ایسی جمہوریت کے نام پر کشمیری عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے کیوں محروم کر رہے ہیں جس کے دعوے عالمی سطح پر کیے جاتے ہیں۔تاریخ میں بعض شخصیات اپنے عہد سے آگے بڑھ کر آنے والی نسلوں کیلئے حوالہ بن جاتی ہیں۔سید علی گیلانیؒ بھی ایسی ہی شخصیت تھے۔ان کے ناقدین نے انہیں سخت گیر اور ان کے مؤقف کو غلط ٹھہرانے کی کوشش کی، مگر ان کے حامیوں کے نزدیک ان کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ انہوں نے اپنے سیاسی نظریے پر سمجھوتہ نہیں کیا۔قید، بیماری، نظربندی، سیاسی دباؤ اور جسمانی کمزوری بھی ان کے عزم کو شکست نہ دے سکی۔سید علی گیلانیؒ کا جسم آج ہمارے درمیان نہیں، لیکن ان کی سیاسی فکر، ان کے خطابات، ان کی تحریریں اور ان کی استقامت کشمیری سیاسی تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اپنے بنیادی مؤقف کو نہیں چھوڑا اور اس اعتبار سے وہ کشمیری مزاحمت کی تاریخ میں ایک نمایاں اور لازوال کردار کے طور پر یاد رکھے جائیں گے۔آج ان کے پانچویں یوم شہادت پر انہیں یاد کرنے کا مطلب صرف ایک شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرنا نہیں بلکہ اس عہد کو یاد کرنا بھی ہے جس کیلئے انہوں نے اپنی پوری زندگی وقف کر دی تھی۔ان کی زندگی ہمارے لیے ایک سبق ہے کہ کسی بھی تحریک میں نظریاتی استقامت، قربانی، علم اور اصول پسندی کس قدر اہم ہوتی ہے۔سید علی گیلانیؒ ایک فرد سے بڑھ کر ایک فکر، ایک مشن اور ایک سیاسی عہد کا نام بن چکے ہیں۔بلاشبہ مقبوضہ جموں وکشمیر کے عوام اپنی جدوجہد میں ان کے نظریات اور قربانیوں سے حوصلہ حاصل پاتے رہیں گے۔سید علی گیلانیؒ دنیا سے رخصت ہو گئے، مگر ان کی آواز، ان کا مشہور نعرہ ہم پاکستانی ہیں اور پاکستان ہمارا ہے اور ان کی جدوجہد کی یاد آج بھی زندہ ہے۔تاریخ ان شخصیات کو کبھی فراموش نہیں کرتی جو اپنی ذات سے اٹھ کر کسی بڑے مقصد کیلئے اپنی زندگی وقف کر دیتی ہیں۔سید علی گیلانی بھی انہی کرداروں میں شامل ہیں جن کا نام جموں وکشمیر کی سیاسی تاریخ میں ایک ایسے رہنما کے طور پر لکھا جائے گا جس نے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اپنے نظریے پر سمجھوتہ نہیں کیا اور یوں تاریخ میں امر ہو گئے۔

منظوم خراج عقیدت

سید محمد مبارک شاہ

امام سید علی گیلانیؒ

قافلہ مضمحل سا جادہ دشوار پر
آگ برساتا ہوا فلک سر عام پر
تشنگی بڑھ رہی تھی دم بہ دم
اور سراب صحرا کہ تھا گام پر
فکر سامری بھی ہمراہ ہوئی گامزن
یوں موحد ہوئے منتشر راہ پر
اک صدا گونج اٹھی اذان کی
عزم وایقان کی علم وعرفان کی
ایک غالب ذہن، دہن انسان کی
تھی صدا یہ علی شاہ گیلان کی
کوبہ کو چھا گئی بوئے گل کی طرح
دشت صحرا کھل گئے زندگی کی طرح
نہیں ممکن غلامی ہم سے انسان کی
ہم نے ٹھانی ہوئی ہے ایمان کی
کوئی راہزن ہمیں لوٹ سکتا نہیں
شان حریت ہم سے چھین سکتا نہیں
لڑ پڑیں گے اسکی خواطر بڑی آن سے
جذبہ ایمان سے طرز افغان سے
ہو میسر نہ جب تک وطن کی آبرو
نسل درنسل لڑیں گے شیطان سے
یہ سبق ملا مبارک قرآن سے
رب ذیشان سے نبی مہربان سے

امیر العظیم کہئے یا امیر الاعظم کہئے
جچتے ہیں یہ نام جس پر اسے شجر سایہ دار کہئے

خواجہ محمد شہباز عارف

16 فروری 1996ء ماہ رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ تھا، میں نے ہزار رنج والم سہہ کر اپنے خوابوں کی سرزمین اسلامی جمہوریہ پاکستان پر قدم رکھا۔سجدہ شکر ادا کیا اپنے مرکزی دفتر پہنچا۔ بزرگوں اور جوانوں سے ملاقی ہوا۔ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ جماعت اسلامی کا ایک وفد مرکز پہنچا۔ہمارے امیر محترم سید صلاح الدین صاحب کے ساتھ ملاقات کرتے ہوئے پوچھا کہ مقبوضہ کشمیر کے حالات کیسے ہیں؟ انہوں نے میری طرف اشارہ کرکے فرمایا یہ ہمارے ساتھی محمد عارف صاحب ہیں، چند دن پہلے اندر سے آئے ہیں۔ یہ آپ کو کشمیر کی تازہ صورتحال سے آگاہ کریں گے۔چونکہ میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا نہ وہ مجھے جانتے تھے لیکن وہ مجھ سے ایسے بغلگیر ہو ہو کر ملے جیسے کہ برسوں کی شناسائی ہو۔ ان میں ایک خوبرو، چہرے پر مسکراہٹ لیے شخصیت نے بڑے ہی پیار سے میرے سر پر دست شفقت رکھ کر فرمایا کہ پہلے ہم سب اپنا تعارف کرائیں گے پھر محترم عارف سے تازہ اپ ڈیٹ لیں گے۔ انہوں نے اپنا تعارف کرتے ہوئے فرمایا: میرا نام امیر العظیم ہے، جماعت اسلامی کا ادنیٰ سا خادم ہوں اور لاہور سے میرا تعلق ہے۔اس کے بعد سب نے اپنا اپنا مختصر تعارف کرایا، آخر پر میں نے اپنا تعارف کرایا اور مقبوضہ جموں وکشمیر کے تازہ حالات بیان کیے۔ پھر سوالات ہوئے جن کا جواب دینے کی بھرپور کوشش میں نے کی۔ دعا کے بعد مجلس برخاست ہوئی۔

یہ میری پہلی ملاقات تھی جناب امیر العظیم صاحب کے ساتھ! چونکہ یہ نام میرے لیے بالکل نیا تھا، پھر ان کی شفقت، ان کی رس گھولتی ہوئی گفتگو ان کے چہرے پر خوشی اور مسکراہٹ نے مجھے ان کا گرویدہ بنالیا۔ پھر دوسری ملاقات ایک دو ماہ بعد بڑا سی کیمپ المعروف جنگل منگل کیمپ میں ہوئی۔ یہاں میں امیر کیمپ کی ذمہ داری نبھا رہا تھا۔محترم امیر العظیم صاحب ایک وفد کی قیادت کرتے ہوئے تشریف لائے اور مہمان خانہ میں کافی دیر تک آر پار کے حالات پر گفت وشنید ہوئی۔ چونکہ اکثر وبیشتر وفود آتے رہتے تھے، مجاہدین کے ساتھ ملاقات کرتے تھے اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ چھ ماہ بعد تنظیم نے مجھے ایک کام کے سلسلے میں بنگلہ دیش روانہ کیا۔وہاں مجھے قانونی طور پر رہنے کے لیے کچھ چھوٹا موٹا کاروباری سلسلہ شروع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ میں نے اپنے امیر محترم سے مشورہ کیا۔ انہوں نے مجھے امیر العظیم صاحب سے رابطہ کرنے کا حکم دیا۔ میں نے فوراً موصوف سے رابطہ کیا اور انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے میری بھرپور رہنمائی فرمائی اور میں نے کہا امیر العظیم صاحب نام کے ہی نہیں بلکہ کام کے امیر العظیم ہیں۔ دو ماہ بعد بنگلہ دیش سے واپس آکر مجھے شعبہ حزب میڈیا میں جناب مسعود صاحب کا معاون مقرر کیا گیا۔تقریباً ایک سال بعد مسعود صاحب میدان کارزار کی طرف چلے گئے

اور مجھے اس شعبے کی مرکزی ذمہ داری سونپی گئی اور حزب المجاہدین کی اعلیٰ قیادت نے فیصلہ کیا کہ ہماری اپنی سالانہ ڈائری اور کیلنڈر وغیرہ چھپوانے کی ضرورت ہے۔میڈیا میں میرے ساتھ محترم ڈار مسرور صاحب، محمد شفیع صاحب اور محترم عمر ملک صاحب کام کرتے تھے۔ہم نے اجتماعی سعی کر کے پہلی بار ڈائری وکیلنڈر برائے سال 1997 تیار کیے اور ٹیبل کیلنڈر بھی تیار کیا۔اس کو چھپوانے کے لیے لاہور کا رخ کیا اور محترم امیر العظیم صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ خوش آمدید کہا اور ڈائری وکیلنڈر کا پرنٹڈ مواد دیکھ کر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔اس ڈائری میں ہر تاریخ کو شہید ہونے والے مجاہد کا نام درج کیا گیا تھا اور کشمیر کا مختصر تعارف بھی لکھا ہوا تھا۔ان کے Future vision سے ہماری چیزیں تیار ہوئیں اور اس دوران مجھے پروف ریڈنگ کے لیے کئی کئی دن ان کے پاس ٹھہرنا پڑا اور یہ سلسلہ کئی برسوں تک جاری رہا۔وہ مجھے اپنے گھر ساتھ لیتے تھے اور میں ان کے بچوں کے ساتھ ملاقات کرتا تھا جو تب بہت چھوٹے تھے۔ وہ بھی میرے گھر تشریف لاتے تھے اور اس طرح دوستی اور تحریکی رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ایک دن جناب حسن نثار صاحب کو ساتھ لیکر ہمارے گھر تشریف لائے اور عشائیہ کے بعد کافی دیر تک آر پار کے حالات پر گفتگو ہوئی۔ میں نے اپنی زندگی میں شاید ہی ایسی کوئی شخصیت تحریکی یا غیر تحریکی حلقوں میں دیکھی ہے جو امیر العظیمؒ جیسی ہو۔وہ جب بھی ملتے تھے گرمجوشی سے ملتے تھے۔میں ایک دن اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر اپنے بیٹے انجینئر محمد انصار اللہ کے پاس لاہور گیا۔میں نے امیر العظیم کو فون کیا۔دعا وسلام کے بعد انہوں نے پوچھا آپ کہاں ہیں؟ میں نے کہا آپ کے شہر لاہور میں ہوں۔فرمایا کہ ملاقات ہوسکتی ہے؟ میں نے کہا یہ تو میری دلی خواہش ہے۔آپ مجھے وقت اور جگہ بتا دیں میں حاضر ہو جاؤں گا۔انہوں نے فرمایا کہ آپ کا بیٹا کس جگہ رہتا ہے میں نے ایڈرس بتایا۔کوئی آدھا گھنٹہ گزر گیا کہ انہوں نے فون کیا عارف صاحب! میں آپ کے ایڈرس پر پہنچا ہوں۔گیٹ سے باہر تشریف لائیں۔اللہ اکبر! میں چونک گیا باہر نکلا حیرت سے پوچھا! حضرت میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔آپ یہاں تشریف لائے۔فرمایا ''آپ میرے دوست اور مہمان ہیں، آپ کو تکلیف کیسے دیتا۔'' میں نے

ان کو چائے پلائی۔میرے بیٹے کے ساتھ انہوں نے خوب گفتگو کی اور یہ جان کرخوش ہوئے کہ میرے بیٹے نے مختلف مما لک سے ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ بہت ساری دعائیں دیں اورہمیں اپنے گھرآنے کی دعوت دی۔ مجھ سے فرمایا”عارف صاحب ایک ٹی وی چینل کا ڈائریکٹر جو میرا اچھا دوست ہے، مجھ سے کشمیر کے موجودہ حالات پر گفتگو کروانا چاہتا تھا۔آج جب آپ کا فون آیا میں نے اس کو کہا کہ آپ کا مسئلہ حل ہوگیا۔مقبوضہ کشمیر کا ایک سینئرساتھی یہاں آیاہے۔اس کاانٹرویو کریں۔وہ حالات کی درست نشاندہی کریں گے۔فرمایا: عارف صاحب آپ اگرتیارہیں تو میں ان سے وقت طے کروں گا۔میں نے عرض کیا،محترم میں اپنے امیر سے پوچھ کر بتاؤں گا کیونکہ مرکز کی اجازت کے بغیر کسی ٹی وی چینل پر انٹرویو دینا ٹھیک نہیں ہے۔فرمایا کہ اچھا! یہ تواچھی بات ہوئی۔”میں نے محترم پیر صاحب سے رابطے کی کوشش کی لیکن نہیں ہوسکا جس کی وجہ سے وہ انٹرویونہیں ہوسکا۔ان دنوں بھارت میں پارلیمانی انتخابات ہورہے تھے، اس لیے میں نے بلا اجازت انٹرویو دینا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ نریندر مودی اور آرایس ایس کے حوالے سے سولات ضرورہوتے تو میرا جواب کہیں پالیسی فیصلے کے برعکس ہوجاتا تو مسئلہ پیدا ہوتا۔”بہرحال جناب امیر العظیم صاحب نےمسکراتے ہوئے فرمایا۔اچھا کوئی بات نہیں انٹرویو ہوتے رہیں گے البتہ امرواطاعت کی پاسداری زیادہ اہم ہے۔ 2001 کی بات ہے۔میری اہلیہ مقبوضہ کشمیر سے واہگہ بارڈر سے پاکستان آرہی تھی۔میں لاہورگیامنصورہ پہنچا، وہاں امیر العظیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پوچھا آج اچانک کیسے آگئے۔میں نے عرض کیا محترم! میری اہلیہ کشمیر سے آرہی ہےان کو واہگہ جا کر ریسو کروں گا۔ فرمایاکس وقت کراس کریں گے۔میں نے کہا شام آٹھ بجے اس طرف پہنچیں گے۔میں نماز عصر کے بعدروانہ ہوجاؤں گا۔وہ مجھے مہمان خانے میں لے گئے۔ چائے پلائی پھر اپنے دفتر فیوچر وژن لے گئے۔نماز عصر کے بعدمیں نےکہاحضرت ُمجھے اجازت دیجئے مجھے آٹھ بجے واہگہ پہنچنا ہے۔فرمایا : عارف صاحب آپ اکیلےنہیں جائیں گے بلکہ ہم اکھٹے جائیں گے۔دفتر کے کچھ کام نپٹا کر مجھے اپنی گاڑی میں بٹھایااور واہگہ بارڈر پر تقریباًایک گھنٹہ میرے ساتھ انتظارکیا۔آٹھ بجےٹرین پہنچی۔میں نے بیگم صاحبہ کو ریسو کیا۔اس کے ساتھ کپوارہ کشمیر کے ایک بزرگ اپنی اہلیہ کے ہمراہ تھے۔وہ دونوں بھی ہمارے ساتھ بیٹھے۔ان کا بیٹا راولپنڈی میں کینسر کے موذی مرض میں مبتلاتھا۔محترم امیرالعظیم صاحب نے ہم سب کو گاڑی میں بٹھا کر اپنے گھر پہنچایا۔ بہت اچھی خاطرتواضع کی۔دوسرے دن ناشتہ کے بعد بس اڈے پہنچایااورخود ہی چار ٹکٹیں خرید کرہمیں”سکائی ویز”بس میں بٹھایا۔میں نے باربارکہا حضرت آپ تکلیف نہ کریں میں خود ہی یہ کام کروں گا لیکن وہ نہیں مانے۔ فرمایا کہ آپ میرے مہمان ہیں،دوست ہیں اورمیں میزبان ہوں۔یہ میرا فرض بنتاہے کہ آپ لوگوں کی خدمت کروں۔جب گاڑی روانہ ہونےلگی توانہوں نےہمیں الوداع کہااور پھر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔اسی طرح کے اور بھی بہت سارے واقعات ہیں جہاں میرے عظیم بھائی، عظیم دوست، امیرالعظیم ؒ نے میری مدد کی، رہنمائی فرمائی اور آسانیاں پیدا کیں۔جب بھی پنڈی اسلام آبادتشریف لاتے تھے مجھے ضرور یاد کرتے تھے۔جب بیمار ہوئے میں نےفون پرخیرت دریافت کی اور دعا دی۔فرمایا: عارف صاحب! یہاں آنے کی زحمت نہیں اٹھانا۔میں چند دنوں میں ٹھیک ہوجاؤں گااوراسلام آباد آکرآپ کوفون کروں گا۔وہاں ہی ملاقات کریں گے۔بس اپنی دعاؤں میں یادرکھنا۔اسکے بعد چندہی دن گزرے کہ دلدوزخبر ملی۔امیرالعظیم اپنے عظیم وکریم رب کے حضورپیش ہوگئے۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ ان کی کامل مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطافرمائے اورلواحقین کو صبرجمیل عطا فرمائے۔

یہی ہوا ہے۔۔۔!

کشفی لکھوی

یہی ہوا ہے جو اس رہ گزر سے گزرے ہیں
ہزار حشر کے منظر نظر سے گزرے ہیں

وہ راہیں آج بھی نقش وفا سے ہیں روشن
مزاج دان محبت جدھر سے گزرے ہیں

خدا کرے نہ وہ گزریں کسی کی نظروں سے
جو سیل درد و بلا میرے سر سے گزرے ہیں

چھپائے آنکھوں میں آنسو دلوں میں درد و فغاں
وفا شناس یوں ہی تیرے در سے گزرے ہیں

تلاش یار میں ہم کیا ڈریں مصیبت سے
ہزار بار رہ پر خطر سے گزرے ہیں

کھلا گئے ہیں محبت کے پھول کانٹوں میں
تمہارے چاہنے والے جدھر سے گزرے ہیں

دل و جگر میں اجالا ہے آج تک جن کا
کچھ ایسے جلوے بھی کشفی نظر سے گزرے ہیں

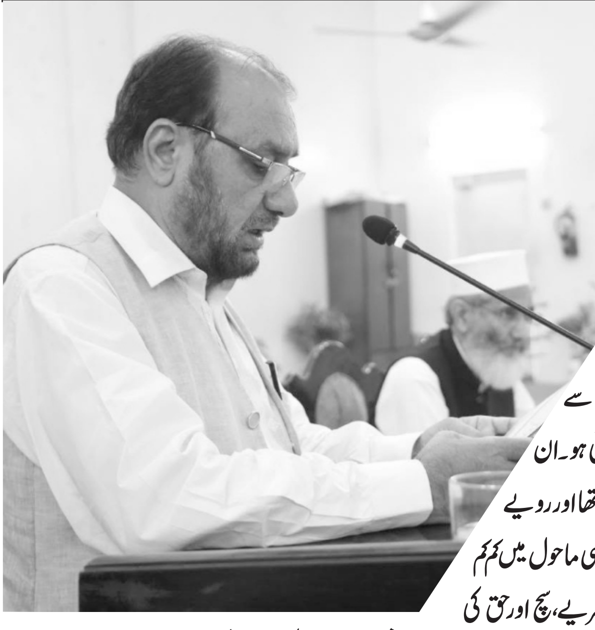

امیرالعظیم

ایک منفرد انسان، ایک محبوب قائد اور دلوں میں بس جانے والی شخصیت

شہباز بڈگامی

کچھ لوگ دنیا میں آتے ہیں، اپنی زندگی گزارتے ہیں اور خاموشی سے رخصت ہو جاتے ہیں، لیکن کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کا وجود محض ایک فرد کا وجود نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک عہد، ایک فکر اور ایک روایت کی علامت بن جاتے ہیں۔ وہ دنیا سے چلے بھی جائیں تو ان کی آواز، ان کا کردار، ان کی محبت، ان کی جدوجہد اور ان کی یاد لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ امیر العظیم بھی ایسی ہی ایک شخصیت تھے۔ وہ واقعی عظیم تھے، ایسے عظیم جنہوں نے صرف ایک جماعت کی قیادت نہیں کی بلکہ اپنے اخلاق، کردار، تدبر، اخلاص اور انسان دوستی سے بے شمار دلوں کو فتح کیا اور ذہنوں میں اپنا ایسا نقش چھوڑ کر گئے جسے وقت کی گرد بھی مٹا نہیں سکتی۔ ایسے لوگ صدیوں بعد جنم لیتے ہیں۔ ان جیسی شخصیات کو کسی ایک جماعت، ایک شہر یا ایک مکتبہ فکر کی حدود میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی عظمت کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے، کیونکہ ان کے تعلقات عہدوں اور سیاسی وابستگیوں سے نہیں بلکہ انسانوں سے ہوتے ہیں۔ امیر العظیم بھی انہی لوگوں میں سے تھے جنہیں اپنے قریب رہنے والا اپنا سمجھتا تھا اور دور سے دیکھنے والا بھی ان کے کردار کا معترف ہو جاتا تھا۔ ان کی شخصیت کو اگر شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال کے اس شعر کے آئینے میں دیکھا جائے تو شاید اس سے بہتر ترجمانی ممکن نہ ہو:

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

امیر العظیم کی زندگی اسی شعر کی عملی تصویر دکھائی دیتی تھی۔ دوستوں، ساتھیوں، کارکنوں اور عام لوگوں کیلئے ان کا لہجہ نرم، انداز شائستہ اور دل محبت سے بھرا ہوا تھا۔ وہ کسی سے ملتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے برسوں سے شناسائی ہو۔ ان کے مزاج میں اپنائیت تھی، گفتگو میں خلوص تھا اور رویے میں ایسی شرافت تھی جو آج کے پراگندہ سیاسی ماحول میں کم کم دکھائی دیتی ہے۔ لیکن جب اصول، حق، نظریے، سچ اور حق کی بات آتی ہے تو یہی نرم مزاج انسان فولاد بن جاتا تھا۔ وہاں نہ مصلحت غالب آتی، نہ دباؤ انہیں جھکا سکتا تھا اور نہ مشکل حالات ان کے عزم کو متزلزل کر سکتے تھے۔ واقعی امیر العظیم بریشم کی طرح نرم بھی تھے اور فولاد کی طرح مضبوط بھی۔ محبت میں نرم، اصول میں سخت؛ تعلق میں مخلص، نظریے میں ثابت قدم؛ بیماری میں صابر، ذمہ داری میں مستعد اور اختلاف میں بھی شائستہ۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت کا ہر کارکن آج ان کی یاد میں آنسو بہاتا ہے۔ کارکنوں کے ساتھ ان کا تعلق محض تنظیمی یا سیاسی نہیں تھا۔ وہ کارکن کو ایک نمبر، ایک ووٹ یا ایک ذمہ داری سمجھنے کے بجائے ایک انسان سمجھتے تھے۔ اس کے دکھ کو محسوس کرتے، اس کی بات سنتے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ قیادت کا تو یہی اصل کمال ہے کہ قائد اپنے کارکنوں کے دل میں جگہ بنائے، اور امیر العظیم نے یہ مقام کسی عہدے کے زور پر نہیں بلکہ اپنے کردار، اپنی دلنشیں گفتگو اور لازوال محبت کے ذریعے حاصل کیا تھا۔ ان کی وفات کا دکھ صرف ان کی جماعت تک محدود نہیں رہا۔ جس کی کامیابی کیلئے انہوں نے اپنے شب وروز صرف کئے۔ بلکہ مختلف سیاسی جماعتوں کے قائدین نے بھی انہیں اپنے اپنے انداز میں یاد کیا اور اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کیا۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ امیر العظیم کی شخصیت سیاسی وابستگیوں کی دیواروں سے بہت بلند تھی۔ اختلافِ رائے اپنی جگہ، سیاسی نظریات اپنی جگہ، مگر کردار اور انسانیت کے معاملے میں ان کے مخالف بھی ان کے مقام کا اعتراف کرتے تھے۔ یہی کسی حقیقی سیاسی اور سماجی شخصیت کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہے کہ اختلاف رکھنے والے بھی اس کے کردار کی گواہی دیں۔ مسلم لیگ ن کے دبنگ رہنما خواجہ سعد رفیق جناب امیر العظیم کو ان الفاظ میں یاد کرتے ہیں: ”جماعت اسلامی پاکستان کے سیکرٹری جنرل جناب امیر العظیم کے انتقال کی دلخراش خبر سن کر دل ودماغ غم سے بھر گئے ہیں“۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ طلبا سیاست کے پر آشوب دور میں 1982 سے 1986 تک انکے ساتھ بطور قریبی حریف مقابلہ رہا جو دہائیوں پہلے قریبی دوستی اور بھائی چارے میں بدل گیا تھا۔ وہ حلیم الطبع، ملنسار، مخلص، بااخلاق اور خوشگوار شخصیت کے حامل گوہرِ نایاب، اپنی ذات میں اِک انجمن تھے۔ طویل سیاسی جدوجہد کے دوران نہایت دلیری اور استقامت سے قید وبند کی صعوبتیں اور ریاستی تشدد سہا لیکن اف تک نہ کی، وہ کبھی

> وہ نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو کی عملی تصویر تھے۔ انہوں نے کینسر کے موذی مرض کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور بیماری کے دوران بھی اپنا نظریاتی و سیاسی کام جاری رکھا۔ اللہ کریم انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دیں، اپنے دیندار بندے کی کامل مغفرت فرمائے اور انکے لواحقین کو صبرِ عظیم سے نوازے۔

رکے نہ جھکے، اسلامی و جمہوری اقدار کے فروغ کیلئے جہد مسلسل انکا شیوہ رہی، وہ نرم دم ِگفتگو اور گرم دم ِجستجو کی عملی تصویر تھے۔ انہوں نے کینسر کے موذی مرض کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور بیماری کے دوران بھی اپنا نظریاتی و سیاسی کام جاری رکھا۔ اللہ کریم انھیں اپنے جوار ِرحمت میں جگہ دیں، اپنے دیندار بندے کی کامل مغفرت فرمائے اور انکے لواحقین کو صبر ِعظیم سے نوازے۔ امیر العظیم کی شخصیت کا ایک نہایت خوبصورت اور دل کو چھو لینے والا پہلو سکھ برادری کے ساتھ ان کا وہ تعلق بھی تھا، جس سے پرایوں کیساتھ ساتھ اپنے بھی لاعلم تھے۔ وہ تھا کرتارپور دربار صاحب کے صحن کی کشادگی کیلئے زمین کی خریداری میں لاکھوں روپے فراہم کرنا، جو آج بھی انہی کے نام پر درج ہے۔ یونہی سکھ برادری کے لوگوں نے ان کی جدائی کو اپنے لیے یتیمی سے تعبیر تو نہیں کیا۔ یہ الفاظ محض رسمی تعزیت نہیں بلکہ اس گہرے تعلق کا اظہار تھے جو امیر العظیم نے مذہب، مسلک اور سیاسی وابستگی سے بالاتر ہو کر انسانوں کے ساتھ قائم کیا تھا۔ انہوں نے اقلیتوں کو محض ایک سیاسی موضوع کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ انہیں اپنے معاشرے کا برابر کا حصہ سمجھا۔ ان کیلئے انسان پہلے انسان تھا، باقی شناختیں اس کے بعد آتی تھیں۔ سکھ برادری کے جذبات اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں کہ امیر العظیم نے اپنے کردار سے محبت کے ایسے پل تعمیر کیے تھے جن پر چلنے کیلئے کسی مذہبی یا سیاسی شناخت کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جدائی کا غم ان لوگوں نے بھی محسوس کیا جن کا ان کی جماعت سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ کسی شخصیت کیلئے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہوسکتا ہے کہ مختلف مذاہب اور طبقات کے لوگ اسے اپنا سمجھ کر روئیں؟ امیر العظیم کی شخصیت کو سمجھنے کیلئے جناب قاضی حسین احمد کے ساتھ ان کے تعلق کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قاضی حسین احمد جیسے عظیم قائد کا انہیں ''اپنا بیٹا'' کہہ کر پکارنا محض شفقت کا اظہار نہیں تھا، بلکہ اس اعتماد، محبت اور تربیتی رشتے کی علامت تھا جو دونوں کے درمیان قائم تھا۔ قاضی حسین احمد نے ان میں ایک ایسا شخص دیکھا جس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا، جسے ذمہ داری سونپی جا سکتی تھی اور جو مشکل ترین حالات میں بھی نظریاتی استقامت کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔ امیر العظیم نے بھی اس اعتماد کی لاج رکھی۔ شدید اور جان لیوا بیماری کے باوجود گزشتہ چھ برسوں سے جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل کی انتہائی اہم اور بھاری بھرکم ذمہ داری جس متانت، تحمل، تقویٰ اور استقامت کے ساتھ انہوں نے نبھائی، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بیماری انسان کو اندر سے توڑ دیتی ہے، جسمانی کمزوری قدم روک دیتی ہے اور زندگی کے معمولات بھی مشکل ہو جاتے ہیں، مگر امیر العظیم نے اپنی تکلیف کو اپنی ذمہ داری کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ انہوں نے اپنی بیماری کا بوجھ اپنے ساتھیوں پر ڈالنے کے بجائے اپنی ذمہ داری کا بوجھ خود اٹھائے رکھا۔ چھ برس تک سیکرٹری جنرل جیسے منصب پر فائز رہنا اپنی جگہ ایک بڑا امتحان ہے، لیکن جان لیوا بیماری کے ساتھ اس ذمہ داری کو نبھانا ایک غیر معمولی عزم کا تقاضا کرتا ہے۔ اجلاس، تنظیمی معاملات، کارکنوں سے روابط، سیاسی حالات کا جائزہ، جماعت کے فیصلے اور روزمرہ کی بے شمار مصروفیات۔ یہ سب کچھ اس وقت انجام دینا جب جسم مسلسل بیماری سے نبرد آزما ہو، عام انسان کیلئے شاید ناقابل تصور ہو۔ مگر امیر العظیم کیلئے ذمہ داری صرف عہدے کا نام نہیں تھی؛ وہ اسے ایک امانت سمجھتے تھے۔ اسی لیے بیماری بھی ان کے عزم کو شکست نہ دے سکی۔ ان کی متانت میں دکھائی دینے والی خاموش طاقت اور ان کے تقویٰ میں جھلکتی ہوئی عاجزی شاید ان کی شخصیت کا سب سے خوبصورت پہلو تھی۔ وہ شور بپا کرنے کے بجائے کام کرنے پر یقین رکھتے تھے۔ اپنی خدمات کا چرچا کرنے کے بجائے ذمہ داری پوری کرنا ان کا شعار تھا۔ آج جب سیاست میں بلند آواز، تند و تیز زبان اور ذاتی تشہیر کو کامیابی کی علامت سمجھا جانے لگا ہے، ایسے میں امیر العظیم جیسی شخصیت یہ یاد دلاتی ہے کہ اصل قیادت بلند آواز ہونے کا نام نہیں، بلکہ بلند کردار کا نام ہے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ شاید یہی تھا کہ انہوں نے لوگوں کو متاثر کرنے کیلئے مصنوعی انداز اختیار نہیں کیا۔ وہ جیسے تھے، ویسے ہی نظر آئے۔ ان کے اندر جو تھا، وہی ان کے الفاظ، رویوں اور فیصلوں میں دکھائی دیتا تھا۔ اسی سچائی نے انہیں لوگوں کے دلوں میں جگہ دی۔ آج جب جماعت اسلامی کا کارکن انہیں یاد کرتا ہے تو اس کی آنکھ نم ہو جاتی ہے۔ ساتھیوں کو ان کی گفتگو یاد آتی ہے، ان کا مسکرانا یاد آتا ہے، ان کا حوصلہ دینا یاد آتا ہے، ان کی شفقت یاد آتی ہے اور مشکل وقت میں ان کی مضبوط موجودگی یاد آتی ہے۔ سیاسی مخالفین انہیں اپنے انداز میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ وہ چلے گئے، مگر اپنے پیچھے ایک ایسا خلا چھوڑ گئے جسے پر کرنا آسان نہیں۔ ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ان کی کمی صرف ایک جماعت کو محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ تمام لوگ انہیں یاد کرتے ہیں جنہوں نے کبھی ان کی محبت، شفقت، قیادت یا انسان دوستی کا لمس محسوس کیا۔ بلاشبہ امیر العظیم واقعی عظیم تھے۔ عظمت صرف بڑے منصب، شہرت یا اختیار کا نام نہیں، عظمت یہ ہے کہ انسان اپنے بعد لوگوں کے دلوں میں زندہ رہے۔ عظمت یہ ہے کہ اپنے بھی روئیں اور غیر بھی۔ عظمت یہ ہے کہ سیاسی مخالف بھی احترام سے نام لیں، مختلف مذہب رکھنے والے بھی جدائی کو یتیمی کہیں، اور کارکن اپنی زندگی کے ایک محبوب باب کے بند ہونے پر آنسو بہائیں۔

ایسے لوگ زمانے سے کہاں ڈھونڈ کر لائیں؟ ایسی شخصیات صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں۔ وہ آتے ہیں، اپنے کردار سے ایک مثال قائم کرتے ہیں، لوگوں کے دل جیتتے ہیں اور پھر رخصت ہو کر بھی اپنے نقشِ قدم چھوڑ جاتے ہیں۔ امیر العظیم بھی انہی لوگوں میں سے ایک تھے۔ ایک عظیم قائد، ایک شفیق انسان، ایک بااصول رہنما اور ایک ایسی یاد جو مدتوں دلوں میں زندہ رہے گی۔ یہ سعادت بھی عظیم مفکر صاحب ِتفسیر سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے شاگرد کے حصے میں آئی ہے۔

واقعی وہ عظیم تھے، جو ہر مکتبہ فکر کو رلا گئے۔

سکھ برادری کے جذبات اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں کہ امیر العظیم نے اپنے کردار سے محبت کے ایسے پل تعمیر کیے تھے جن پر چلنے کیلئے کسی مذہبی یا سیاسی شناخت کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جدائی کا غم ان لوگوں نے بھی محسوس کیا جن کا ان کی جماعت سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ کسی شخصیت کیلئے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہوسکتا ہے کہ مختلف مذاہب اور طبقات کے لوگ اسے اپنا سمجھ کر روئیں؟

سلاخیں بھی نہ جھکا سکیں جسے، وہ امیر العظیم بھی خاموش ہو گئے

وہ جس نے جوانی جیل میں اور زندگی جماعت کے نام کر دی، سیاست کے شور میں خاموشی سے تاریخ لکھنے والا شخص

سید عمر اویس گردیزی

وہ شام کچھ ایسی تھی جیسے لاہور کے افق پر سورج ڈوبتے ہوئے اپنے ساتھ کوئی معمولی روشنی نہیں، ایک پورا زمانہ لے جا رہا ہو۔ فضا میں بظاہر سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ سڑکیں رواں تھیں، شہر اپنی بے اعتنائی میں مصروف تھا، اخبار اپنے اگلے دن کی خبروں کے لیے الفاظ جمع کر رہے تھے، اور سیاسی دنیا اپنے معمول کے شور میں گم تھی۔ مگر کہیں ایک خاموش کمرے میں زندگی کی آخری ساعتیں ایک ایسے شخص کے گرد اپنی گرفت مضبوط کر رہی تھیں جس نے عمر بھر خاموش رہنے کے بجائے اپنے یقین کی آواز کو زندہ رکھا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وقت خود چند لمحوں کے لیے رک کر کسی طویل داستان کا آخری ورق پڑھ رہا ہو۔ وہ شخص جس نے کبھی طالب علم کی حیثیت سے کتابیں اٹھائی تھیں، پھر انہی ہاتھوں میں جدو جہد کا پرچم آیا، جس نے یونیورسٹی کے ایوانوں میں طلبہ کی آواز بن کر بات کی۔ پابندیوں کے عہد میں سوال اٹھایا، قید کی تاریکی دیکھی، سلاخوں کے پیچھے وقت گزارا، مگر اپنے عزم کو سلاخوں کے حوالے نہ کیا۔ جس نے جوانی کے شعلہ فشاں موسموں سے گزر کر تنظیمی زندگی کی طویل مسافت طے کی، جس کے حصے میں نعرے بھی آئے، ذمہ داریاں بھی، اختلافات بھی، آزمائشیں بھی اور منصب بھی؛ مگر جس کی شناخت کسی ایک عہدے کے نام سے نہیں بلکہ ایک مسلسل سفر کے نام سے ہوئی۔ وہ سفر جو ایک طالب علم سے شروع ہوا اور ایک ایسے تنظیمی مقام تک پہنچا جہاں ہزاروں کارکنوں کی امیدیں اور ایک پوری جماعت کی ذمہ داریاں اس کے کاندھوں پر تھیں۔ پھر اچانک یوں لگا جیسے تاریخ کی کسی پرانی کتاب کا ایک روشن باب آہستہ سے بند ہوگیا ہو۔ ایک آواز خاموش ہوگئی، مگر اس خاموشی میں کتنے سوال باقی رہ گئے! کیا سیاست صرف ایوانوں تک پہنچنے کا نام ہے؟ کیا نظریہ صرف تقریروں میں زندہ رہتا ہے؟ کیا کارکن ہونا صرف ہجوم میں کھڑے ہونے کا نام ہے؟ اور کیا انسان اپنے عہدے سے بڑا ہوسکتا ہے؟ ان سوالوں کے جواب شاید کسی تقریر، کسی تعزیتی قرارداد یا کسی اخباری خبر میں نہیں ملیں گے۔ ان کا جواب ایک ایسی زندگی کے اوراق میں چھپا ہے جس نے جوانی میں قید دیکھی، تنظیم میں عمر گزاری، ذمہ داری کو منصب پر ترجیح دی اور بیماری کے آخری موسم میں بھی اپنے عہد سے رشتہ منقطع نہ ہونے دیا۔ بعض لوگ سیاست کے میدان میں آتے ہیں، چند معرکے سر کرتے ہیں، کچھ عہدے پاتے ہیں، چند انتخابات لڑتے ہیں، چند تقریریں کرتے ہیں اور پھر وقت کے بے رحم سیلاب میں کہیں دور بہہ جاتے ہیں۔ تاریخ ان کے ناموں کو کبھی حاشیے پر رکھتی ہے، کبھی کسی پرانی کتاب کے زرد صفحات میں دفن کر دیتی ہے۔ مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی زندگی کسی عہدے کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ منصب پر ہوں یا نہ ہوں، اقتدار کے ایوان میں بیٹھے ہوں یا جیل کی کوٹھڑی میں، جلسے کے اسٹیج پر ہوں یا کسی خاموش کمرے میں بیماری کے ساتھ نبرد آزما، ان کے وجود سے ایک پورا فکری سفر عبارت ہوتا ہے۔ امیر العظیم مرحوم بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھے۔ یہ داستان امیر العظیم کی ہے، ایک ایسے سیاسی کارکن، تنظیمی رہنما، سابق طلبہ رہنما، صحافتی ترجمان اور جماعت اسلامی کے مرکزی ذمہ دار کی، جس کی زندگی کو محض عہدوں کی فہرست میں مقید کرنا اس کے طویل سفر کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ان کا اصل تعارف منصب نہیں، تسلسل تھا۔ ایک ایسا تسلسل جو طالب علمی سے شروع ہوا، جدو جہد کی دھوپ میں پختہ ہوا، قید کی تاریکی سے گزرا، تنظیمی ذمہ داریوں کی بھٹی میں کندن بنا اور زندگی کے آخری ایام تک اپنے نظریاتی و جماعتی رشتے سے منقطع نہ ہوا۔ ایک صحافی کی حیثیت سے سیاسی شخصیات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ بعض چہرے کیمرے کے سامنے بہت بڑے دکھائی دیتے ہیں مگر وقت کی ذرا سی گردش انہیں معمولی بنا دیتی ہے، جبکہ کچھ لوگ منظر کے مرکز میں نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی شخصیت کا ایسا نقش چھوڑ جاتے ہیں جو برسوں بعد بھی مٹتا نہیں۔ امیر العظیم کا شمار میرے نزدیک اسی دوسری قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی تنظیمی سنجیدگی تھی۔ گفتگو میں مقصدیت، سیاسی اختلاف میں ایک مخصوص سختی اور جماعتی ذمہ داری میں وہ استقلال جو آدمی کو محض عہدے دار سے کارکن بنا دیتا ہے۔ ان کی زندگی کا ابتدائی باب طالب علمی سے وابستہ ہے۔ لاہور میں پیدا ہونے والے امیر العظیم نے تعلیم کے مختلف مدارج طے کیے اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ مگر ان کی فکری و عملی تشکیل کا ایک بڑا میدان تعلیمی اداروں کی وہ دنیا تھی جہاں نوجوان محض کتابیں نہیں پڑھتے بلکہ اپنے زمانے کے

> **امیر العظیم کا شمار میرے نزدیک اسی دوسری قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی تنظیمی سنجیدگی تھی۔ گفتگو میں مقصدیت، سیاسی اختلاف میں ایک مخصوص سختی اور جماعتی ذمہ داری میں وہ استقلال جو آدمی کو محض عہدے دار سے کارکن بنا دیتا ہے۔**

سوالوں سے بھی دو چار ہوتے ہیں۔ اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستگی نے ان کے سفر کو ایک منظم نظریاتی سمت عطا کی اور پھر وہ پنجاب یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے صدر منتخب ہوئے۔ یہ منصب کسی نسبتاً پُرسکون زمانے کی معمولی طلبہ سرگرمی نہیں تھی۔ ملک میں طلبہ یونین پر پابندی کا عہد تھا، سیاسی فضا میں گھٹن تھی اور نوجوانوں کے جمہوری اظہار کے راستے محدود تھے۔ ایسے ماحول میں طلبہ یونین کی بحالی کی جدوجہد محض یونیورسٹی کے داخلی معاملات کا مسئلہ نہیں رہی تھی؛ وہ آزادیِ اظہار، طلبہ کے سیاسی حق اور جمہوری مزاج کے ایک وسیع تر سوال میں تبدیل ہو چکی تھی۔ امیر العظیم نے اس جدوجہد میں حصہ لیا، احتجاج کیا، لانگ مارچ کی قیادت کی، گرفتاری اور مقدمات کا سامنا کیا اور جیل کی صعوبت برداشت کی۔ ان کی زندگی کا یہ باب اس لیے اہم ہے کہ یہاں ان کے سیاسی مزاج کی بنیادیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔۔۔ جس بات کو درست سمجھا، اس کے لیے قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہونا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب قید کے دوران اسلامی جمعیت طلبہ کی قیادت کی ذمہ داری بھی ان کے حصے میں آئی اور وہ ناظمِ اعلیٰ کے منصب تک پہنچے۔ اس واقعے کو محض ایک تنظیمی تقرری سمجھ لینا شاید اس کے پس منظر کی معنویت کو کم کر دے۔ ایک نوجوان جو آزادی سے محروم ہو، جیل کی دیواروں کے اندر ہو، مگر اسی دوران اس کے رفقا اسے اپنی قیادت کے لیے منتخب کریں، یہ اس کے کردار اور تنظیمی اعتماد کی ایک گہری شہادت ہوتی ہے۔ یہیں سے ان کی زندگی میں ایک ایسا وصف نمایاں ہوتا ہے جو بعد کے تمام ادوار میں ان کے ساتھ رہا۔ تنظیم کے لیے خود کو وقف کر دینا۔ امیر العظیم کی سیاست انتخابی موسموں کی سیاست نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ کسی اسمبلی کی نشست کے حصول کے بجائے تنظیمی ذمہ داریوں میں گزارا۔

جماعت اسلامی میں ان کا سفر بتدریج مختلف ذمہ داریوں سے گزرتا ہوا مرکزی سطح تک پہنچا۔ وہ جماعت اسلامی کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات رہے، لاہور اور وسطی پنجاب کی تنظیمی قیادت سنبھالی اور بالآخر مرکزی سیکرٹری جنرل کی ذمہ داری تک پہنچے۔ مرکزی سیکرٹری اطلاعات کے منصب پر ان کا کردار خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ صحافت اور سیاست کے سنگم پر کھڑا یہ منصب محض جماعتی موقف بیان کرنے کا نام نہیں بلکہ سیاسی واقعات کو سمجھنے، جماعتی پالیسی کو عوام تک منتقل کرنے اور میڈیا کے سوالات کے سامنے تنظیمی موقف کی ترجمانی کرنے کا ایک پیچیدہ عمل ہے۔ ایک صحافی کی نگاہ سے دیکھا جائے تو امیر العظیم میں یہ صلاحیت نمایاں تھی کہ وہ اپنے موقف کو سیاسی زبان میں پوری قطعیت کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ ان کے انداز میں بعض اوقات سختی محسوس ہوتی تھی، مگر وہ سختی ان کے سیاسی مزاج کی پیداوار تھی۔ وہ اپنے نظریے کو محض ایک عارضی سیاسی بیان نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے لیے جماعتی وابستگی ایک طویل فکری سلسلہ تھی، جس میں اختلاف، تنقید، تنظیم، کارکن اور قیادت سب ایک بڑے نظم کے اجزا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی میں ان کا مقام محض کسی ایک عہدے سے متعین نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے تنظیم کو نچلی سطح سے سمجھا تھا۔ وہ کارکن کے مرحلے سے گزرے، طلبہ تنظیم میں قیادت کی، جیل دیکھی، ابلاغی ذمہ داریاں سنبھالیں، علاقائی تنظیم کی قیادت کی اور پھر مرکزی سیکرٹری جنرل کے منصب تک پہنچے۔ یہ ایک ایسا سفر تھا جس میں منصب منزل نہیں بلکہ ذمہ داری کی ایک نئی منزل بنتا چلا گیا۔ 2019ء میں انہیں جماعت اسلامی پاکستان کا مرکزی سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا اور بعد ازاں حافظ نعیم الرحمٰن کی قیادت میں بھی وہ اس ذمہ داری پر برقرار رہے۔ یہ تسلسل اس بات کی علامت تھا کہ جماعت کے اندر ان کی تنظیمی صلاحیت اور تجربے پر اعتماد قائم تھا۔ مگر امیر العظیم کی زندگی کا سب سے متاثر کن پہلو شاید ان کا یہ تنظیمی تسلسل ہی تھا۔

ہماری سیاست میں عموماً لوگ اقتدار کے قریب آ کر نمایاں ہوتے ہیں، مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اقتدار سے دور رہ کر اپنی جماعت کے اندر کئی دہائیوں تک کام کرتے ہیں۔ ان کی کامیابی کسی وزارت، کسی سرکاری منصب یا کسی بڑے پروٹوکول میں نہیں بلکہ کارکنوں کے اعتماد، تنظیمی تجربے اور مسلسل محنت میں مضمر ہوتی ہے۔ امیر العظیم اسی روایت کے آدمی تھے۔ طلبہ یونین کی بحالی کی تحریک سے لے کر جماعت اسلامی کی مرکزی قیادت تک ان کے سفر میں ایک عجیب سا ربط نظر آتا ہے۔ نوجوانی میں وہ طلبہ کے سیاسی حق کے لیے میدان میں تھے، بعد میں وہ ایک بڑی نظریاتی جماعت کے انتظامی ڈھانچے میں ذمہ داری نبھاتے رہے۔ یوں ان کی سیاست میں طالب علم، کارکن، منتظم، ترجمان اور مرکزی رہنما الگ الگ کردار نہیں بلکہ ایک ہی طویل داستان کے مختلف ابواب معلوم ہوتے ہیں۔ اور پھر زندگی کا آخری باب آیا۔ بیماری نے جسم کو کمزور کیا، مگر ذمہ داری کے احساس کو مضمحل نہ کر سکی۔ عمر بھر جس شخص نے تنظیمی زندگی کو اپنا معمول بنایا ہو، اس کے لیے شاید بیماری بھی اس تعلق کو یکسر منقطع نہیں کر سکتی۔ آخری ایام تک ان کا جماعتی کردار کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہا۔ جسمانی کمزوری اپنی جگہ تھی، مگر وابستگی کی وہ ڈور آخری سانسوں تک قائم رہی جس سے ان کی پوری زندگی بندھی ہوئی تھی۔ 22 جولائی 2026ء کو ان کا انتقال ہوا تو ایک شخص دنیا سے رخصت ہوا، مگر ایک طویل سیاسی و تنظیمی داستان اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔ ان کی موت کو صرف جماعت اسلامی کے ایک مرکزی سیکرٹری جنرل کی وفات کہنا شاید کافی نہ ہوگا۔ وہ ایک ایسی نسل کے نمائندہ تھے جس نے سیاست کو سوشل میڈیا کی چند سطروں، انتخابی جلسوں کی وقتی گھن گرج اور اقتدار کے ایوانوں کی چمک سے پہلے ایک

ایک صحافی کی نگاہ سے دیکھا جائے تو امیر العظیم میں یہ صلاحیت نمایاں تھی کہ وہ اپنے موقف کو سیاسی زبان میں پوری قطعیت کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ ان کے انداز میں بعض اوقات سختی محسوس ہوتی تھی، مگر وہ سختی ان کے سیاسی مزاج کی پیداوار تھی۔ وہ اپنے نظریے کو محض ایک عارضی سیاسی بیان نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے لیے جماعتی وابستگی ایک طویل فکری سلسلہ تھی، جس میں اختلاف، تنقید، تنظیم، کارکن اور قیادت سب ایک بڑے نظم کے اجزا تھے۔

مختلف صورت میں دیکھا تھا۔ وہ دور جس میں نظریے کے ساتھ وابستگی کے لیے جیل جانا پڑتا تھا، تنظیم کے لیے برسوں کام کرنا پڑتا تھا، اور سیاسی شناخت بنانے کے لیے عمر کے بڑے حصے کو ایک جماعتی نظم کے سپرد کرنا پڑتا تھا۔ اختلاف رکھنے والے ان کی سیاست سے اختلاف کر سکتے ہیں، ان کے نظریات پر سوال اٹھا سکتے ہیں، ان کی جماعتی ترجیحات سے اتفاق یا عدم اتفاق رکھ سکتے ہیں۔ مگر ایک صحافی کے لیے ایک طویل سیاسی زندگی کی محنت، استقامت اور تنظیمی تسلسل کا اعتراف اختلاف رائے سے الگ ایک حقیقت ہے۔ امیر العظیم کی اصل میراث شاید کوئی عہدہ نہیں۔ وہ ایک سوال ہے۔ ایسا سوال جو آج کے سیاسی کارکن سے پوچھتا ہے کہ سیاست آخر کس چیز کا نام ہے؟ اقتدار کا، شہرت کا، منصب کا، یا کسی فکر کے ساتھ عمر بھر چلنے کا؟ وہ نوجوان سے پوچھتے ہیں کہ کیا نظریہ صرف تقریر تک محدود رہتا ہے یا اس کی قیمت بھی ادا کرنا پڑتی ہے؟ وہ جماعتی کارکن سے پوچھتے ہیں کہ عہدہ ملنے سے پہلے جو آدمی کارکن تھا، کیا عہدہ ملنے کے بعد بھی کارکن رہ سکتا ہے؟ اور شاید وہ ہم صحافیوں سے بھی پوچھتے ہیں کہ کیا ہم سیاست دانوں کو صرف ان کے عہدوں، بیانات اور تنازعات سے دیکھیں گے، یا ان کے پیچھے چھپی ہوئی کئی دہائیوں کی انسانی داستان کو بھی پڑھنے کی کوشش کریں گے؟ امیر العظیم اب موجود نہیں، مگر ان کی زندگی کا سفر ہمارے سامنے ہے۔ طالب علم سے صدرِ طلبہ یونین تک، تحریک سے قید تک، قید سے ناظمِ اعلیٰ تک، تنظیم سے مرکزی ترجمان تک، لاہور وسطی پنجاب کی قیادت سے مرکزی سیکرٹری جنرل تک، اور پھر بیماری کے سایوں میں بھی ذمہ داری کی آخری لکیر تک۔ یہ کسی ایک منصب کی کہانی نہیں، یہ وابستگی کی داستان ہے۔ اور شاید اسی لیے ان کی رخصتی پر سب سے بڑا سوال یہ نہیں کہ جماعت اسلامی نے اپنا ایک رہنما کھو دیا، بلکہ یہ ہے کہ کیا ہماری موجودہ سیاست میں اب بھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو عہدے سے پہلے کارکن، اقتدار سے پہلے نظریے اور شہرت سے پہلے ذمہ داری کو ترجیح دیں؟ اگر اس سوال کا جواب آنے والی نسلیں تلاش کرتی رہیں تو امیر العظیم کا سفر ختم نہیں ہوگا۔ وہ ایک شخص کی موت کے بعد بھی، ایک سوال کی صورت میں زندہ رہیں گے۔

امیر بھی اور عظیم بھی

مجیب الرحمان شامی

امیر العظیم دنیا سے رخصت ہوئے ہیں تو اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ کتنے امیر اور کتنے عظیم تھے۔ ان کی زندگی میں بھی ان کا اعتراف کرنے والے بہت تھے لیکن انتقال کے بعد تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ سیاست اور صحافت کی دنیا کے ہر شخص کو کچھ کھو جانے کا احساس ہوا ہے۔ ہر اک شے میں کسی شے کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ وہ اسلامی جمعیت طلبہ سے ہوتے ہوئے جماعت اسلامی میں پہنچے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کی طلبہ یونین کے صدر منتخب ہوئے، جیل میں تھے کہ اسلامی جمعیت طلبہ کے ارکان نے انہیں اپنا ناظم اعلیٰ چن لیا۔ طالب علمی کا دور ختم ہوا تو ادھر ادھر جھانکنے کے بجائے سر جھکا کر جماعت اسلامی میں داخل ہو گئے۔ جس راستے پر چلنے کا عہد کیا تھا اسی راستے پر چلتے رہے۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جماعت اسلامی میں بھی ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ یہاں عہدوں کی بندر بانٹ ہوتی ہے نہ ان کے لیے لوگ ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوتے ہیں۔ یہاں منصب ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کا نام ہے اس لیے اس کی تمنا دلوں میں کم ہی پالی جاتی ہے۔ امیر العظیم بھی اپنی مسکراہٹ اور انکساری کی بدولت ممتاز سے ممتاز تر ہوتے چلے گئے۔ جماعت اسلامی کے سیکرٹری اطلاعات بنے تو اسے نئی توانائی بخشنے میں لگ گئے۔ اس سے پہلے صفدر علی چودھری کا سکہ چل رہا تھا۔ ان کی طاقت بھی دھیمے لہجے اور مسکراہٹ میں تھی۔ وہ ادیب تھے نہ خطیب لیکن دل میں اترتے چلے جاتے تھے۔ جناب سراج الحق کی امارت میں امیر العظیم نے سیکرٹری جنرل کا عہدہ سنبھالا، ان سے پہلے لیاقت بلوچ، ان سے پہلے سید منور حسن، ان سے پہلے قاضی حسین احمد اور ان سے کہیں پہلے میاں طفیل محمد اس ذمہ داری کو نبھا چکے تھے۔ ان دنوں سیکرٹری جنرل کو قیم، کہا جاتا تھا۔ جماعت اسلامی اپنے سکے اپنی ٹکسال میں ڈھال رہی تھی، سیکرٹری جنرل کے بجائے اس نے اپنے "منتظم اعلیٰ"، کو

قیم کا نام دے رکھا تھا لیکن پھر "قیم" پر سیکرٹری جنرل غالب آ گیا جدت نے قدامت پر قابو پا لیا۔ میاں طفیل محمد نے جماعت اسلامی کا نظم کھڑا کرنے اور اس کی مؤثر نگرانی کرنے میں کمال حاصل کیا تھا، مولانا مودودیؒ نے مسند خالی کی تو ارکان جماعت کی بھاری اکثریت نے "قیم" کو اپنا امیر بنا لیا۔ میاں صاحب کا دورِ امارت ہنگامہ خیز رہا۔ 1970ء کے انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان کا صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا، اس کے بعد مغربی حصہ "نیا پاکستان" بن کر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے قبضے میں آ چکا تھا۔ میاں طفیل محمد 1970ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کے بائیں بازو کے ستون شیخ رشید کے مقابلے میں الیکشن ہارے تھے۔ امارت کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر آن پڑی تو بھٹو ازم کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ جیل میں ان کے ساتھ بدسلوکی ہوئی تو گویا ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ مولانا مودودیؒ سے لے کر جماعت اسلامی کے ادنیٰ کارکن تک سب کا خون کھولنے لگا، اس طرح کی بدتمیزی کا کوئی تصور اس سے پہلے قومی سیاست میں نہیں تھا۔ بھٹو صاحب کے جیالوں نے سیاسی اختلاف کو گھٹیا ذاتی دشمنی میں تبدیل کر دیا تھا۔ جماعت اسلامی میدان میں رہی، اتحادی سیاست کو فروغ دیا، پاکستان قومی اتحاد کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا، بالآخر بھٹو اقتدار سے نجات نصیب ہوئی۔ انتخابی دھاندلی کے بعد اٹھنے والے غم و غصے کے طوفان میں یہ کشتی ڈوبی، مارشل لاء نافذ ہوا تو بھٹو مخالف جرنیلی حکومت کے فطری اتحادی قرار پائے۔ پیپلز پارٹی کے ایک دھڑے نے الذوالفقار بنا لی اور طاقت کے ذریعے ضیاء الحق کا تختہ الٹنے کے وہم میں مبتلا ہو گیا۔ ان انقلابیوں کے ساتھ وہ کچھ ہوا کہ ان کے اپنے عہدِ ستم کی کارروائیاں اس کے سامنے ماند پڑ گئیں۔

امیرالعظیم بھی رخصت ہوئے

خالد مسعود خان

برادرِ عزیز امیرالعظیم نہایت ہی عزم و حوصلے اور صبر کے ساتھ اپنی بیماری سے لڑتے ہوئے اپنے اللہ کے حضور پیش ہو گئے۔ انااللہ وانا الیہ راجعون۔ میرا رحیم و کریم مالک امیرالعظیم پر اپنی رحمتیں نازل کرتے ہوئے ان کی آخرت کی منزلیں آسان فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے‘ آمین۔ مجھے امیرالعظیم سے اپنی پہلی ملاقات تو یاد نہیں کہ کب ہوئی لیکن آخری ملاقات یاد ہے۔ 24 مئی 2026ء کو یعنی آج سے دو ماہ قبل برادرم طاہر علوی کے بیٹے کے ولیمے پر ناتواں‘ نڈھال لیکن حوصلہ مند امیرالعظیم سے ملاقات ہوئی تو ان سے مل کر ہمیشہ کی طرح ہونے والی خوشی کے بجائے ملال ہوا اور دل اداس ہو گیا۔ مجھے علم تھا کہ امیرالعظیم کی طبیعت کافی ناساز ہے مگر ایسے امیرالعظیم کا تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا جیسا امیرالعظیم اس دن میرے سامنے تھا۔ دوستی کے معاملے میں ہمارا یہ دوست ایسا تھا کہ اس کی مثال دینا محال ہے لیکن اسے اچھی طرح جاننے کے باوجود حیرت ہوئی کہ وہ اس حالت میں بھی دوستی نبھانے کے لیے ولیمے کی تقریب میں پہنچ سکتا ہے۔ ایسی حالت میں تو ہم جیسا بندہ اسپتال کے بستر سے قدم نیچے نہ رکھے‘ کجا کہ ایک دیرینہ دوست کے بیٹے کے ولیمے میں شرکت کی غرض سے خاصا لمبا فاصلہ طے کرکے پہنچ جائے۔ ایمانداری کی بات ہے کہ امیرالعظیم کی حالت دیکھ کر دل میں عجب قسم کے وسوسے آئے مگر ہم جن سے محبت کرتے ہیں ان کے بارے میں جدائی کی حد پر جا کر سوچنے کے بجائے معجزوں کا انتظار کرتے ہیں۔ اُس روز میرے دل میں بھی معجزے کی شمع روشن ہوئی تھی جو 22 جولائی کو گُل ہو گئی۔ امیرالعظیم سے دوستی کو کئی عشرے بیت چکے ہیں۔ میں جب بہاء الدین زکریا یونیورسٹی سے اخراج کے بعد اپنی بحالی کے لیے لاہور ہائیکورٹ میں دائر کردہ درخواست کی پیروی کے لیے لاہور جاتا تو تاریخ پر حاضر ہونے کے لیے کئی دن لاہور رکنا پڑتا۔ تب ہمارے وکیل ارشاد قریشی تھے۔ ہم اپنے کیس کی تاریخ سے دو دن پہلے ان کے پاس دفتر پہنچ جاتے۔ حلیم الطبع ارشاد قریشی نہ صرف یہ کہ ہمارا کیس مفت لڑ رہے تھے بلکہ ہماری دو چار گھنٹے کی اپنے دفتر میں موجودگی کے دوران بسکٹ اور چائے وغیرہ سے تواضع بھی کرتے رہتے تھے۔ لاہور میں رہائش کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں زیرِتعلیم بہت سے دوستوں کے دل اور کمرے ہمارے لیے وا ہوتے تھے۔ امیرالعظیم سے دوستی کا آغاز انہی دنوں ہوا جو نہ صرف قائم رہا بلکہ وقت کے ساتھ یہ تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ بردرِ عزیز امیرالعظیم دوستوں کے لیے نہ صرف یہ کہ ہمہ وقت چشم براہ رہتے تھے بلکہ دوستی نبھانے کے سلسلے میں اس درجے تک چلے جاتے تھے جو آج کل تقریباً مفقود ہی ہو چکا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں ایک بار ذاتی طور پر ایسا تجربہ ہوا کہ جب اس کا سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ امیرالعظیم دوستی نبھانے اور دوستوں کے لیے حد سے گزر جانے والا ایسا شخص تھا جو اس زمانے میں خال خال ہی باقی بچے تھے اور اب ان کی رخصتی کے بعد یہ خلا مزید بڑھ گیا ہے۔ میں اپنے نہایت ہی عزیز مرحوم دوست احمد بلال کے پاس کراچی گیا تو اس نے مجھے بتایا کہ اس کی ایک بیوہ کزن جس کے دو تین چھوٹے چھوٹے بچے ہیں‘ نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد لاہور کی ایک مہنگی رہائشی کالونی میں واقع اپنا مکان ایک وکیل کو کرائے پر دے دیا اور خود ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں منتقل ہو گئی تاکہ وہ اپنے مکان سے ملنے والے کرائے سے گھر اور بچوں کے اخراجات پورے کر سکے۔ اس خاتون نے اس دوران ایک پرائیویٹ اسکول میں نوکری بھی کر لی مگر جس وکیل کو مکان کرائے پر دیا تھا اس نے نہ صرف یہ کہ کرایہ دینا بند کر دیا بلکہ الٹا گھر کی ملکیت کا دعویٰ بھی کر دیا۔ احمد بلال نے مجھے اس مسئلے کا بتایا اور مدد طلب کی۔ میں نے یہ بات امیرالعظیم سے کی تو انہوں نے اس مسئلے کو حل کرنے کی ہامی بھر لی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے تب اس معاملے کی پوری سنگینی کا شاید اندازہ ہی نہیں تھا۔ امیرالعظیم نے حامی کیا بھری‘ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہر ممکن طریقہ آزمایا۔ پہلے تو اس وکیل سے ملاقات کر کے اس کو مکان مالکہ کے حالات اور مالی مشکلات کا بتایا اور کرائے کی ادائیگی یا گھر خالی کرنے میں سے ایک کام کرنے کا کہا مگر سب کچھ بے فائدہ نکلا۔ پھر امیرالعظیم نے اس سلسلے میں علاقے کے معززین کو اکٹھا کر کے ایک پنچایت کی مگر یہ بھی بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ امیرالعظیم نے اس پر وکلا تنظیم کے ذریعے دباؤ ڈالا تو اس نے جواباً امیرالعظیم کے خلاف اپنے حامی وکلا کی مدد سے ایک درخواست جمع کروا دی اور ایک روز گھر آنے پر 15 پر فون کر کے پولیس بلوا لی۔ امیرالعظیم پولیس کے آنے پر ان کے ساتھ چل پڑے‘ وہ تو ان کے انچارج نے امیرالعظیم کو پہچان لیا اور کہا کہ آپ نے بتایا کیوں نہیں کہ آپ کون ہیں۔ امیرالعظیم نے کہا: میرا تعارف اتنا اہم نہیں جتنا یہ کہ آپ حقداروں کے لیے تو کچھ نہیں کرتے مگر ناجائز قابضین کے تحفظ کے لیے فوراً سے پیشتر پہنچ جاتے ہیں۔ ایمانداری کی بات ہے کہ یہ معاملہ اگر خود میرے ذمے ہوتا تو شاید میں اس سے دستبردار ہو

جاتا مگر امیر العظیم کو داد دینا پڑتی ہے کہ انہوں نے نہ تو ہمت ہاری اور نہ ہی اپنی کوششوں میں کوئی کمی آنے دی۔اس مسلسل بھاگ دوڑ اور پیچھا کرنے کے دوران امیر العظیم کو کسی ذریعے سے یہ علم ہوا کہ وکیل موصوف کی ایل ایل بی کی ڈگری جعلی ہے۔امیر العظیم نے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ امتحانات سے اس ڈگری کی تصدیق کرائی تو وہ واقعتاً جعلی نکلی۔اب امیر العظیم نے اس وکیل کے وکالتی لائسنس اور بار کی رکنیت کی منسوخی کا معاملہ اٹھا دیا اور دونوں کام پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بعد جعلی وکیل کو کہا کہ اگر آپ گھر خالی کر دیں تو معاملہ یہیں ختم ہو جائے گا بصورت دیگر میں آپ پر جعلی ڈگری' فراڈ وکالت اور گھر پر ناجائز قبضے کے سلسلے میں فوجداری کیس دائر کر دوں گا۔اس نے امیر العظیم کی مستقل مزاجی' بے خوفی اور ڈٹے رہنے کا مظاہرہ دیکھتے ہوئے عافیت اسی میں جانی کہ گھر چھوڑ دے۔آج بھی وہ خاندان امیر العظیم کو دعائیں دے رہا ہے۔ یہ صرف ایک واقعہ تھا۔اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم اعلیٰ اور جمعیت کے پلیٹ فارم سے پنجاب یونیورسٹی کے صدر رہنے والے امیر العظیم نے سیاسی حوالے سے اقتدار کی کرسی اور دنیاوی فوائد کی جانب جانے والے راستے کے بجائے نظریاتی راستے کا انتخاب کیا جو طویل بھی تھا اور کٹھن بھی۔عملی زندگی میں آنے کے بعد بہت سے دیگر ہم عصر طلبہ کے برعکس اقتدار کے شارٹ کٹ کے طور پر سکہ رائج الوقت سیاسی جماعتوں میں شمولیت کے بجائے جماعت اسلامی کی راہ اختیار کی اور گزشتہ سات سال سے اس کے جنرل سیکرٹری کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔وہ گزشتہ کچھ عرصے سے کینسر جیسے موذی مرض کا شکار تھے مگر اس تمام عرصہ میں بھی رخصت لینے اور آرام کرنے کے بجائے آخر دم تک اپنی تنظیمی اور جماعتی سرگرمیاں سر انجام دیتے رہے۔ عالی ہمت' باحوصلہ اور ہر آزمائش پر مسکرانے والا یہ دوست مورخہ 22 جولائی کو دارِفانی سے عالم جاودانی کی طرف روانہ ہو گیا۔مجھے امید ہی نہیں یقین ہے کہ مالک روزِ جزا امیر العظیم کو آخرت کی منزلوں اور حساب میں وہی آسانیاں فراہم کرے گا جو اس کی تائید و اجازت سے اس کا یہ بندۂ دنیا میں مخلوقِ خدا کو فراہم کرتا رہا ہے۔افسوس ہوا کہ میں اس کی نمازِ جنازہ میں شرکت نہ کر سکا' مگر اطمینان ہے کہ مالکِ کائنات ہم فقیروں کی دعائیں زمان و مکان سے بالاتر ہو کر سنتا ہے۔

حسین حقّانی کا Aquarium اور امیر العظیمؒ کی Legacy

حسین اصغر صاحب کی وال سے

جنرل ضیاء الحق کے دورِ جبر میں جب امیر العظیمؒ کوٹ لکھپت جیل میں قید تھے، اسلامی جمعیت طلبہ نے انہیں اپنا ناظمِ اعلیٰ منتخب کیا۔شوریٰ کے اراکین نے جیل میں ان سے حلف لیا۔انہوں نے زندگی کے آخری سانس تک اس عہد کو نبھایا اور بالآخر اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔ان کی رحلت کی خبر نے ماضی کا ایک تلخ واقعہ ذہن میں تازہ کر دیا۔کراچی یونیورسٹی میں جمعیت کی ذمہ داری کے دوران، ڈاؤ میڈیکل یونیورسٹی کی ایک کانفرنس کے سلسلے میں مجھے سابق وفاقی وزیر حسین حقانی سے

”اس پر وہ جھنجھلا گئے اور حقارت سے بولے۔۔تو کیا آپ چاہتے تھے کہ میں امیر العظیم کی طرح Aquarium میں رہنے والی مچھلی بن جاتا؟ میں نے جواب دیا۔۔۔اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔جسے آپ Aquarium کہہ رہے ہیں وہ دراصل آپ کی اپنی محدود دنیا ہے، جبکہ امیر العظیم ایک ایسے سمندر کے مسافر ہیں جس کی وسعت اخلاص، دعوت اور استقامت سے عبارت ہے۔بات چیت میں تلخی بڑھی تو ہمارے ایک ساتھی نے ان سے جمعیت کے لیے مالی اعانت کی بات کی۔

ان کی ڈیفنس رہائش گاہ پر ملنے کا اتفاق ہوا۔حسین حقانی پہلے جمعیت میں رہے اور کراچی یونیورسٹی طلبہ یونین کے صدر منتخب ہوئے، مگر بعد میں اپنی راہ بدل کر پیپلز پارٹی اور اقتدار کی سیاست سے وابستہ ہو گئے۔یہ ملاقات ابتدا ہی سے تلخ رہی۔میں نے ان سے پوچھا : ”آپ نے تحریکِ اسلامی کو چھوڑ کر ایک سیکولر جماعت کا انتخاب کیوں کیا؟“ انہوں نے جواب دیا : ”میرے سامنے دو راستے تھے۔جیسے کوئی اسٹیشن پر کھڑا ہو اور ایک ٹرین چل رہی ہو، تو میں نے چلتی ہوئی ٹرین میں سوار ہونا مناسب سمجھا۔“ میں نے عرض کیا : ”ہر چلتی ٹرین منزل پر نہیں پہنچتی۔اگر وہ مخالف سمت جا رہی ہو تو سوار کبھی منزل نہیں پا سکتا۔“

میں نے فوراً رد کرتے ہوئے کہا کہ جس تحریک پر اللہ کا فضل اور لاکھوں مخلصین کا ساتھ ہو، وہ کسی حسین حقانی کی محتاج نہیں۔وقت سب سے بڑا گواہ ثابت ہوا۔آج دنیا نے دیکھ لیا کہ نظریے اور اخلاص پر قائم رہنے والے امیر العظیمؒ آخری وقت تک دین کی خدمت کرتے ہوئے لاکھوں دلوں کی دعاؤں کے ساتھ رخصت ہوئے۔جبکہ ”چلتی ٹرین“ کے مسافروں کا انجام سب کے سامنے ہے۔کامیابی رفتار سے نہیں، درست سمت سے ناپی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ امیر العظیم بھائیؒ کی مغفرت فرمائے، ان کی قربانیوں کو قبول کرکے انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، اور ہمیں بھی استقامت اور حسنِ خاتمہ نصیب کرے۔آمین

مین آف آل سیزن امیر العظیمؒ

نظریے کا امین، استقامت کا استعارہ

میر بابر مشتاق

قوموں کی تاریخ میں کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جنہیں صرف ان کے عہد سے نہیں، بلکہ ان کے کردار، نظریاتی استقامت اور قربانیوں سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ وقت کی گرد میں گم نہیں ہوتیں بلکہ وقت کے دھارے کا رخ متعین کرتی ہیں۔ ان کی زندگی محض ایک فرد کی داستان نہیں ہوتی بلکہ ایک فکر، ایک تحریک اور ایک عہد کی ترجمان بن جاتی ہے۔ امیر العظیمؒ بھی ایسی ہی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جن پر تحریک اسلامی بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ وہ صرف ایک تنظیمی ذمہ دار یا سیاسی کارکن نہیں تھے بلکہ سراپا نظریہ تھے۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ انسان اگر کسی مقصد سے سچی وابستگی اختیار کر لے تو حالات کی سختیاں، جیل کی سلاخیں، کوڑوں کی ضربیں اور اقتدار کی چمک دمک بھی اس کے قدم متزلزل نہیں کر سکتیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی معروف کتاب "تحریک اور کارکن" میں جس کارکن کا تصور پیش کیا ہے، وہ ایسا انسان ہے جو دعوت کو اپنی ذات پر مقدم رکھتا ہے، آزمائشوں سے گھبراتا نہیں، اقتدار کو منزل نہیں بلکہ ذمہ داری سمجھتا ہے اور ہر حال میں اپنے رب کی رضا کو سب سے بڑا مقصد بناتا ہے۔ امیر العظیمؒ ان اوصاف کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ ان کی شخصیت میں اخلاص، نظم، استقامت، علم، اخلاق اور جرأت ایک ساتھ جمع تھے اور یہی امتزاج انہیں اپنے معاصرین سے ممتاز بناتا تھا۔ انیس سو اسی کی دہائی پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک کڑا دور تھا۔ جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت نے سیاسی سرگرمیوں پر سخت پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ اختلافِ رائے کو جرم سمجھا جاتا تھا، اخبارات سنسر شپ کی زد میں تھے اور جامعات میں طلبہ کی آزادانہ سرگرمیوں کو ریاستی خطرہ تصور کیا جا رہا

تھا۔ ایسے ماحول میں اکثر سیاسی قوتیں خاموشی یا مصلحت کا راستہ اختیار کیے ہوئے تھیں۔

لیکن اسلامی جمعیت طلبہ نے خاموش رہنے کے بجائے مزاحمت کا راستہ چنا۔ طلبہ یونین پر پابندی کے خلاف 1983ء اور 1984ء میں جو تحریک اٹھی، وہ صرف ایک تنظیمی احتجاج

> سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی معروف کتاب "تحریک اور کارکن" میں جس کارکن کا تصور پیش کیا ہے، وہ ایسا انسان ہے جو دعوت کو اپنی ذات پر مقدم رکھتا ہے، آزمائشوں سے گھبراتا نہیں، اقتدار کو منزل نہیں بلکہ ذمہ داری سمجھتا ہے اور ہر حال میں اپنے رب کی رضا کو سب سے بڑا مقصد بناتا ہے۔ امیر العظیمؒ ان اوصاف کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔

نہیں تھا بلکہ نوجوانوں کے جمہوری حق کی جنگ تھی۔ اس تحریک میں ہزاروں طلبہ گرفتار ہوئے، سینکڑوں کو تعلیمی اداروں سے نکالا گیا اور درجنوں نوجوانوں نے کوڑوں کی سزائیں برداشت کیں، مگر ان کے عزم میں کوئی کمی نہ آئی۔ اسی تحریک کی صفِ اول میں امیر العظیمؒ کھڑے تھے۔ وہ اس وقت اسلامی جمعیت طلبہ پنجاب کے ناظم تھے۔ انہوں نے اپنے کارکنوں کو صرف تقریروں سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے قیادت دی۔ جب گرفتاریوں کا وقت آیا تو وہ پیچھے نہیں ہٹے، جب تشدد کا سامنا ہوا تو انہوں نے صبر کا دامن نہیں چھوڑا، اور جب آزمائشیں بڑھیں تو ان کے حوصلے مزید بلند ہوتے گئے۔ ان کی زندگی کا ایک یادگار باب وہ ہے جب دورانِ اسیری انہیں اسلامی جمعیت طلبہ کا ناظمِ اعلیٰ منتخب کیا گیا۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا کہ ایک نوجوان، جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھا، اپنے رفقا کے اعتماد کا مرکز بنا اور اسی قید کے عالم میں اپنی نئی ذمہ داری کا حلف اٹھایا۔ یہ اعتماد کسی عہدے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے کردار، اخلاص اور نظریاتی پختگی کی وجہ سے تھا۔

جیلوں میں انہیں جسمانی اذیتیں دی گئیں، تشدد کیا گیا، کوڑوں کی سزائیں سنائی گئیں، مگر ان کی زبان پر شکایت کے بجائے عزم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ نظریات کی قیمت ادا کیے بغیر تاریخ میں کوئی روشن باب نہیں لکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آمریت کے سامنے جھکنے کے بجائے استقامت کی علامت بن گئے۔ اس دور کا ایک واقعہ آج بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ معروف صحافی قومی ڈائجسٹ کے مدیر مجیب الرحمان شامی صاحب نے امیر العظیمؒ کی زخمی حالت میں ایک تصویر سرورق پر شائع کی۔ تصویر نے پورے ملک میں تہلکہ مچا دیا۔ رسالہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوا اور لوگوں کو پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ طلبہ رہنماؤں کے ساتھ کس قدر سخت سلوک کیا جا رہا ہے۔ بعد ازاں ایک پریس کانفرنس میں جنرل ضیاء الحق سے اسی تصویر کے حوالے سے سوال کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی پوری حکمرانی میں شاذ ہی کبھی جذباتی ہوئے ہوں، مگر اس سوال پر وہ برہم ہو گئے اور غصے میں کہا:

" کوئی امیر العظیم ہو یا امیر المعظم...... میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا"

اگلے روز یہی جملہ قومی اخبارات کی سرخی بنا۔ بظاہر یہ ایک

جملہ تھا، مگر درحقیقت یہ اس حقیقت کا اعتراف بھی تھا کہ ایک نوجوان طلبہ رہنما آمریت کے ایوانوں تک اپنی مزاحمت کی آواز پہنچا چکا تھا۔

امیر العظیمؒ کی عظمت صرف اس بات میں نہیں تھی کہ انہوں نے قید و بند برداشت کیا، بلکہ اس بات میں تھی کہ انہوں نے ان آزمائشوں کو اپنی شخصیت کی تلخی نہیں بننے دیا۔ جیل ہی کے زمانے میں انہوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور ایم بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ یہ اس نوجوان کی کہانی تھی جو حالات کا شکار بننے کے بجائے حالات کو اپنی تربیت کا ذریعہ بنا رہا تھا۔ ان کی خطابت میں دلیل تھی، گفتگو میں وقار تھا، مطالعہ ان کا مستقل شوق تھا اور تنظیم ان کی پہچان۔ وہ نوجوانوں کو صرف جذبات نہیں دیتے تھے بلکہ شعور بھی دیتے تھے۔ وہ صرف نعرہ نہیں لگاتے تھے بلکہ نعرے کے پیچھے موجود فکر بھی سمجھاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے مخالف بھی ان کی علمی استعداد، اخلاق اور استقامت کا اعتراف کرتے تھے۔ آج جب سیاست میں نظریے سے زیادہ مفاد، اصول سے زیادہ مصلحت اور کردار سے زیادہ تشہیر کو اہمیت دی جا رہی ہے، تو امیر العظیمؒ جیسے کردار ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ تحریکیں نعروں سے نہیں بلکہ ایسے لوگوں کے خون، پسینے، صبر اور اخلاص سے زندہ رہتی ہیں۔ ان کی زندگی اس حقیقت کی روشن دلیل ہے کہ جو لوگ نظریے کے لیے جیتے ہیں، وہ اپنی زندگی میں بھی محترم رہتے ہیں اور اپنی وفات کے بعد بھی تاریخ کے روشن باب بن جاتے ہیں۔

امیر العظیمؒ کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ صرف ایک مزاحمتی رہنما نہیں تھے بلکہ ایک بہترین مربی، منتظم اور انسان شناس بھی تھے۔ تاریخ میں ایسے بہت سے لوگ گزرے ہیں جو جیلیں کاٹنے یا آمریت کا مقابلہ کرنے کی وجہ سے مشہور ہوئے، مگر رہائی کے بعد ان کی شخصیت میں سختی، تلخی یا انتقام کا رنگ نمایاں ہو گیا۔ امیر العظیمؒ اس اعتبار سے منفرد تھے کہ آزمائشوں نے ان کے لہجے میں تلخی پیدا نہیں کی بلکہ ان کے کردار میں مزید وقار، تحمل اور وسعت پیدا کر دی۔ اسلامی جمعیت طلبہ میں ان کی تربیت نے انہیں یہ شعور دیا تھا کہ تنظیمیں صرف نعروں سے نہیں، بلکہ انسان سازی سے مضبوط ہوتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جہاں بھی گئے، کارکنوں کی تربیت، علمی نشستوں، مطالعے کی روایت اور باہمی اخوت کو اپنی اولین ترجیح بنایا۔ ان کے نزدیک تنظیم کا اصل سرمایہ عمارتیں یا وسائل نہیں، بلکہ باکردار انسان تھے۔ بعدازاں جب وہ جماعت اسلامی پاکستان کے قیم منتخب ہوئے تو انہوں نے اسی مزاج کو مزید وسعت دی۔

امیر العظیمؒ کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ صرف ایک مزاحمتی رہنما نہیں تھے بلکہ ایک بہترین مربی، منتظم اور انسان شناس بھی تھے۔ تاریخ میں ایسے بہت سے لوگ گزرے ہیں جو جیلیں کاٹنے یا آمریت کا مقابلہ کرنے کی وجہ سے مشہور ہوئے، مگر رہائی کے بعد ان کی شخصیت میں سختی، تلخی یا انتقام کا رنگ نمایاں ہو گیا۔ امیر العظیمؒ اس اعتبار سے منفرد تھے کہ آزمائشوں نے ان کے لہجے میں تلخی پیدا نہیں کی بلکہ ان کے کردار میں مزید وقار، تحمل اور وسعت پیدا کر دی۔

ان کے لیے جماعت صرف ایک سیاسی جماعت نہیں تھی بلکہ ایک دعوتی اور اصلاحی تحریک تھی۔ وہ اختلافِ رائے کو برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے اور کارکنوں کی بات پوری توجہ سے سنتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جماعت کے مختلف طبقات میں انہیں غیر معمولی احترام حاصل تھا۔ امیر العظیمؒ کی زندگی کا ایک اور خوبصورت پہلو ان کا حسنِ اخلاق تھا۔ لاہور کی علمی، سماجی اور سیاسی فضا میں وہ گویا جماعت اسلامی کا چلتا پھرتا تعارف تھے۔ ان سے ملنے والا ہر شخص، خواہ وہ جماعت سے تعلق رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، ان کی شائستگی، انکساری اور خلوص کا معترف نظر آتا تھا۔ اشرافیہ کے افراد ہوں، صحافی ہوں، وکلا، اساتذہ، طلبہ یا عام شہری، ہر شخص ان سے بلا تکلف ملتا، اپنی بات کہتا اور رہنمائی لیتا۔ ان کے دروازے پر آنے والے سے کبھی یہ سوال نہیں کیا جاتا تھا کہ وہ کس جماعت، کس مکتبِ فکر یا کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ انسان کو پہلے انسان سمجھتے تھے، پھر اس کی شناخت کو دیکھتے تھے۔ یہی وصف بڑے انسانوں کی پہچان ہوتا ہے۔

وہ گفتگو میں اختلاف ضرور کرتے تھے، مگر اختلاف کو دشمنی میں تبدیل نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان کی زبان شائستگی سے آراستہ اور لہجہ احترام سے مزین رہتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ دلیل کی طاقت گالی سے کہیں زیادہ مؤثر ہوتی ہے، اور کردار کی بلندی کسی بھی سیاسی کامیابی سے زیادہ دیرپا اثر چھوڑتی ہے۔ امیر العظیمؒ کے سامنے کئی ایسے لوگ آئے جنہوں نے وقتی سیاسی فائدے کے لیے اپنے نظریات تبدیل کیے، جماعتیں بدلیں، راستے بدلے اور اقتدار کے ایوانوں تک پہنچ گئے۔ بظاہر وہ کامیاب دکھائی دیے، مگر وقت نے ثابت کیا کہ نظریے کے بغیر حاصل ہونے والی کامیابیاں ریت کی دیوار ثابت ہوتی ہیں۔ اگر امیر العظیمؒ بھی چاہتے تو ان کی سیاسی صلاحیت، غیر معمولی خطابت، تنظیمی تجربہ اور عوامی پذیرائی انہیں اقتدار کی سیاست میں بہت آگے لے جا سکتی تھی۔ مگر انہوں نے کبھی اقتدار کو مقصد نہیں بنایا۔ انہوں نے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے اس فکر کو اپنایا کہ اقتدار خود مطلوب نہیں، بلکہ اللہ کی بندگی پر مبنی نظام کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی لیے انہوں نے اقتدار کی سیڑھیوں کے بجائے نظریے کے راستے کو اختیار کیا۔ آج کے نوجوانوں کے لیے ان کی زندگی میں ایک بہت بڑا سبق موجود ہے۔

مرکزی شوریٰ کے اجلاس کی ایک تصویر نے امیر العظیمؒ کی پوری شخصیت کو گویا ایک فریم میں سمو دیا۔ وہ امیرِ جماعت کے پہلو میں ہمیشہ کی طرح خاموش وقار، کامل اطاعت اور بے لوث اخلاص کے ساتھ موجود تھے۔ نہ منصب کا احساس، نہ عمر اور تجربے کا غرور، نہ کسی شکوے کا شائبہ؛ صرف ایک مخلص کارکن، ایک داعی اور ایک سچا سپاہی۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی سے یہ ثابت کیا کہ تحریکیں شخصیات کے گرد نہیں بلکہ اصولوں کے گرد سفر کرتی ہیں، اور ایک حقیقی کارکن وہی ہوتا ہے جو ہر ذمہ داری کو اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کرے۔ امیر العظیمؒ کی انکساری، دیانت، امانت، وفاداری اور حسنِ اخلاق ان کی اصل پہچان تھے۔ میری ان سے

امیرالعظیم

آصف محمود

امیر العظیم انتقال کر گئے۔ بنو عامر اپنے قیس سے محروم ہو گیا۔ جو جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ جو زمین اوڑھ کر سو رہا ہے، یہ بلند بخت اس زمین کا نمک تھا۔ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ امیر العظیم ان لوگوں میں سے نہ تھے جو جماعت اسلامی کو مقبرہ سمجھ کر اوپر چندہ باکس رکھ کر بیٹھے ہیں۔ انہوں نے جماعت کی نیک نامی کی بنیاد پر اپنی ذاتی کاروباری امپائر کھڑی نہیں کی بلکہ اپنی دنیا خود پیدا کی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں پیاس بجھانے کے لیے اپنے کنویں خود کھودنا ہوتے ہیں۔ انہوں نے ناخنوں سے اپنے کنویں کھودے اور خود کو سیراب کیا۔ ابتدائے سفر میں زمانے کا سرد و گرم بھی دیکھا اور پھر آسودہ بھی ہوئے۔ اس ساری مسافت میں ان کے دامن پر کہیں دھول نہیں تھی۔ وہ کنول کی طرح اجلے رہے۔

امیر العظیم آزاد فضاؤں کے پنچھی تھے۔ ذات، گروہ، جماعت یا نظریہ انہیں کسی خول میں بند نہ کر سکا۔ ہر مکتب فکر کے لوگوں سے ان کی دوستی تھی۔ انہوں نے سب سے تعلق کو نبھایا۔ ان کے حلقہ احباب میں سب صالحین نہ تھے، گناہ گار بھی تھے، سرخے بھی تھے اور صف کی دوسری جانب کے کئی لوگ بھی انہیں عزیز جاں رکھتے تھے۔ ایک ہی دائرے میں رہنے سے، بھلے وہ نظریاتی ہی کیوں نہ ہو، آدمی کی افتادِ طبع محدود ہو جاتی ہے۔ امیر العظیم مگر سراپا وسعت تھے۔ نام ہی کتنا وجیہہ تھا۔ امیر العظیم۔ ایک عرصے تک میں یہی سمجھتا رہا، یہ بھی کوئی منصب ہے۔ جیسے ناظم اعلیٰ ہوتا ہے ویسے ہی کوئی امیر العظیم بھی ہوتا ہوگا۔ اضاخیل میں اجتماع عام تھا۔ میرے ساتھ میرا کزن بھی چلا آیا۔ امیر العظیم صاحب سے ملاقات ہوئی تو مجھ سے سرگوشی میں پوچھتا ہے: ان کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا: امیر العظیم۔ بولا: وہ تو مجھے معلوم ہے یہ امیر العظیم ہیں لیکن ان کا نام کیا ہے۔ میں نے کہا یہ ایک ایسا منصب ہے جس پر فائز ہونے کے بعد نام تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب یہ امیر العظیم ہی ہیں۔ امیر العظیم پاس ہی بیٹھے تھے، محفل میں قہقہے پھوٹ پڑے۔ میری تو چند ہی ملاقاتیں رہیں، مختصر۔ لیکن ان کے احباب بتاتے ہیں کہ جو کام ان کو سونپ دیا جاتا تھا اس کی یاد دہانی کی حاجت نہیں رہتی تھی۔ کام دوستوں کا ہو یا تحریک کا جب ان کے ذمے لگا دیا گیا تو سمجھیے ہو گیا۔ کام بیچ میں چھوڑنے کے وہ قائل نہ تھے اور اس معاملے میں اپنے اور غیر کا کوئی فرق ان کے ہاں نہ تھا۔ متعدد گواہیاں ہیں، وقت کے ساتھ سامنے آتی رہیں گی اور یاد دلاتی رہیں گی، کیسا بلند بخت شخص تھا، جو نہ رہا۔ سیاست اب ایک طوفان بدتمیزی ہے، امیر العظیم اس مزاج کے آدمی ہی نہ تھے۔ عزتیں اچھالنے اور شعلہ کلامی کا فن انہیں نہیں آتا تھا۔ سیاست کے معروف کرداروں جیسے معروف بھی نہ تھے۔ لیکن ان کے انتقال کی خبر سنتے ہی یوں لگا جیسے برگد کا کوئی درخت گر گیا ہو۔ ایک ایسا درخت جو جنگل میں ایک گوشے میں چپ چاپ کھڑا تھا، جس کا کوئی شور نہ تھا، مگر جب ٹوٹ گرا تو معلوم ہوا کیا حادثہ ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ شاید ایسے ہوتے ہیں جن کی اہمیت کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ نہیں رہتے۔ پھر پتہ چلتا ہے کہ کیا حادثہ بیت گیا۔ اب انہیں ڈھونڈ و چراغ رخ زیبا لے کر۔ میرے پاس یادوں کا ایسا کوئی خزینہ نہیں کہ دہراؤں اور محفل خوشبو ہو جائے۔ میری تو چند لمحوں پر مشتمل چند ملاقاتیں ہیں۔ ایک وہ جس کا احوال اوپر بیان کر دیا۔ ایک بار جناب خورشید ندیم کے ساتھ لاہور میں امیر العظیم صاحب کے گھر پر ملاقات ہوئی تھی۔ کبھی فون پر بھی کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ لیکن ان کے انتقال نے سوگوار کر دیا۔ دکھی کر دیا۔ شاید ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں سے آپ کی روح ایک تعلق میں بندھ جاتی ہے۔ یہ احترام کا ایک تعلق ہوتا ہے۔ یا شاید کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی محبت اور احترام اللہ آپ کے دلوں میں ڈال دیتا ہے۔ وہ آپ سے فاصلے پر بھی ہوں تو تاروں کی طرح لگتے ہیں، لو دیتے رہتے ہیں۔

پھر ایک روز وہ تارا ٹوٹ جاتا ہے، پھر تاریکی ہو جاتی ہے۔ ملاقاتیں اگرچہ محدود رہیں، مگر ہر ملاقات میں ان کی شفقت، عاجزی اور محبت نے یہی احساس دلایا کہ بڑے لوگ اپنے عہدوں سے نہیں، اپنے کردار سے بڑے ہوتے ہیں۔

موجودہ دور میں سوشل میڈیا کی مقبولیت کو اکثر کامیابی سمجھ لیا جاتا ہے، وقتی شہرت کو اصل سرمایہ تصور کیا جاتا ہے اور نظریات کو مفادات کے تابع کر دیا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں امیر العظیمؒ کی زندگی ہمیں یاد دلاتی ہے کہ اصل کامیابی ٹرینڈ بننے میں نہیں، بلکہ کردار بننے میں ہے؛ اصل عزت منصب سے نہیں، بلکہ اصولوں پر ثابت قدم رہنے سے ملتی ہے۔ ان کی پوری زندگی اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ تحریکیں افراد سے بڑی ضرور ہوتی ہیں، مگر تاریخ انہی افراد کے کردار سے لکھی جاتی ہے جو اپنے نظریے کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہوں۔ امیر العظیمؒ نے کبھی اپنے اصولوں کو حالات کے مطابق نہیں بدلا، بلکہ اپنے کردار سے حالات کو بدلنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کی وفات پر صرف جماعت اسلامی یا اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکن ہی غمزدہ نہیں، بلکہ وہ تمام لوگ افسردہ ہیں جنہوں نے انہیں قریب سے دیکھا، ان کے اخلاق سے فیض پایا یا ان کی استقامت سے حوصلہ حاصل کیا۔ ایسے لوگ جسمانی طور پر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، مگر ان کی فکر، ان کی تربیت، ان کے شاگرد اور ان کی جدوجہد آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ بن جاتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے بارے میں اقبالؒ نے کہا تھا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

امیر العظیمؒ بھی انہی دیدہ ور انسانوں میں سے ایک تھے۔ وہ واقعی مین آف آل سیزن تھے۔ احتجاج کی صف میں بھی نمایاں، تنظیم کی مجلس میں بھی مؤثر، تربیت کے میدان میں بھی سرگرم، فکری نشست میں بھی مدلل، اور تعلقاتِ عامہ میں بھی بے مثال۔ ان کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ نظریے سے وفاداری، کردار کی پاکیزگی اور انسانوں سے محبت ہی وہ سرمایہ ہے جو انسان کو مرنے کے بعد بھی زندہ رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ امیر العظیمؒ کی کامل مغفرت فرمائے، ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور تحریکِ اسلامی کو ان جیسی مخلص، باعمل اور ثابت قدم شخصیات کا نعم البدل عطا فرمائے آمین

امیرالعظیم بھائی بھی داغ مفارقت دے گئے

محمد شاہد شیخ

اسلام کے داعی، جماعت اسلامی کے سپاہی، طلبہ کی جمہوری تحریک کے عظیم قائد امیرالعظیم بھی رب کے حضور پیش ہوگئے ہیں۔ وہ کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ یہ ایسا ظالم مرض ہے کہ انسان کو ہلکان کیے رکھتا ہے جس میں

زندگی بھی مشکل ہے، موت بھی آسان نہیں
میں جیوں گا، مروں گا اس کا بھی امکاں نہیں

اس غیر یقینی صورتِ حال میں امیرالعظیم استقامت کا نمونہ بنے ہر غم دل میں چھپاتے رہے، دوستوں کو حوصلہ دیتے اور مسکراتے رہے۔ لیکن زندگی کا وقت معین ہے، یہ موت کی امانت ہے۔ اگرچہ موت کا مزا ہر ذی نفس کو چکھنا ہے لیکن بعض اموات ایسی ہوتی ہیں جو دوسروں کی زندگی اداس کردیتی ہیں۔ امیرالعظیم بھی ہزاروں نہیں لاکھوں کو اداس کرگئے ہیں۔

چند دن پہلے ہی میں اور ڈاکٹر شاہد رفیق، عظیم بھائی کی عظمت کا تذکرہ کررہے تھے، وہ دن یاد آرہے تھے جب عظیم بھائی اپنے دو ساتھیوں طیب شاہین اور ضیاء الدین انصاری کے ساتھ کوٹ لکھپت جیل میں اسیر تھے، اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے اراکین کی اکثریت نے انہیں اکتوبر 1986ء میں آئندہ سیشن کے لیے ناظم اعلیٰ منتخب کرلیا تھا۔ مسئلہ درپیش تھا کہ ان سے حلفِ نظامت اور بقیہ تنظیمی امور کے لیے مشاورت کیسے کی جائے؟ جمعیت نے اپنا اثر رسوخ استعمال کیا اور جیل میں ہی مرکزی شوریٰ کا اجلاس و تقریبِ حلف برداری کا اہتمام کیا گیا۔ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ حکومت اور جیل انتظامیہ کو علم تھا کہ یہ جرم ۔ بے گناہی میں قید ہیں لہٰذا سپرنٹنڈنٹ کے کمرے کے اوپر خصوصی ملاقاتی روم میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اراکین پہنچ گئے۔ مجھ سمیت اس یادگار اجلاس میں محترم راشد نسیم بھائی جو نظامتِ اعلیٰ کے منصب سے فارغ ہوئے تھے، محترم سراج الحق صاحب، ڈاکٹر شاہد رفیق، سید شاہد ہاشمی، ڈاکٹر معراج الہدیٰ، ریحان الحسن، ڈاکٹر شہاب الدین غازی، بحراللہ، ڈاکٹر فخرالاسلام، سید محمد عباس، ملک یعقوب اعوان، حافظ تنویر، محمود شاہ، جہانگیر خان، نذر حسین سنپال، اظہر اقبال حسن، عارف بلوچ، و دیگر شریک تھے۔ نو منتخب ناظمِ اعلیٰ کی حلف برداری کے بعد عظیم بھائی نے ہم اراکین شوریٰ سے فرداً فرداً ملاقاتیں کیں۔ مشاورت کے بعد سید محمد عباس (ناظم جمعیت کراچی) کو معتمد عام مقرر کیا گیا، جبکہ فارغ ہونے والے ناظم اعلیٰ راشد نسیم کو قائم مقام ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا جس کے بعد قیادت کے جیل میں ہونے کے باوجود جمعیت کا تنظیمی و دعوتی کام و سرگرمیاں جاری رہیں۔

امیرالعظیم معمولی آدمی نہیں تھے، وہ مزاحمت کا استعارہ، استقامت کا پیکر، جمہوری مزاج کے حامل، دردِ دل رکھنے والے ملنسار انسان تھے۔ جماعت اسلامی میں صائب الرائے لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ وہ محترم قاضی حسین احمدؒ سے لے کر محترم سید منور حسنؒ اور محترم سراج الحق سے لے کر محترم حافظ نعیم الرحمٰن تک سب کی خصوصی مشاورتوں میں رہے۔ تنظیمی امور سے لے کر سیاسی معاملات تک حکمتِ عملی ترتیب دینے میں ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ جماعت اسلامی پاکستان کے سیکریٹری جنرل (قیم) کی ذمہ داری نہایت عمدگی سے نبھا رہے تھے۔ جب تک بستر سے نہیں لگ گئے، اپنے عہدے پر قائم رہے۔

امیرالعظیم 3 اکتوبر 1958ء کو کرشن نگر (اسلام پورہ) لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین 1947ء میں ہجرت کرکے پاکستان آئے۔ ان کی والدہ جماعت اسلامی سے وابستہ ہوگئیں، جس کا اثر امیرالعظیم پر بھی پڑا۔ وہ بچپن ہی سے تحریک کی طرف مائل ہوئے۔ پڑھنے لکھنے کا شعور آیا تو اردو ڈائجسٹ سے لے کر سید مودودیؒ کا لٹریچر...... سب پڑھ ڈالا۔ قرآن و

وہ محترم قاضی حسین احمدؒ سے لے کر محترم سید منور حسنؒ اور محترم سراج الحق سے لے کر محترم حافظ نعیم الرحمٰن تک سب کی خصوصی مشاورتوں میں رہے۔ تنظیمی امور سے لے کر سیاسی معاملات تک حکمتِ عملی ترتیب دینے میں ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ جماعت اسلامی پاکستان کے سیکریٹری جنرل (قیم) کی ذمہ داری نہایت عمدگی سے نبھا رہے تھے۔ جب تک بستر سے نہیں لگ گئے، اپنے عہدے پر قائم رہے۔

حدیث سے تعلق مضبوط کیا۔ ایم بی اے کے ساتھ ایم اے اسلامیات بھی کیا اور 1975ء میں جمعیت میں باقاعدہ شامل ہوئے۔ ناظمِ لاہور سے لے کر ناظم پنجاب تک ذمہ داریاں ادا کیں۔ 1982ء میں اسٹوڈنٹس یونین پنجاب یونیورسٹی کے صدر منتخب ہوگئے اور 1986ء میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ عظیم بھائی کا دور بڑا معرکہ خیز تھا۔ جمعیت جنرل ضیاء الحق کے مارشل لا کو للکارنے کی سزا بھگت رہی تھی، جنرل ضیاء الحق جمعیت کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف تھے، اسی لیے انہوں نے 1984ء میں طلبہ انجمنوں وتنظیموں پر پابندی عائد کردی، پھر کوشش کی کہ پنجاب میں ایم ایس ایف کے ذریعے جمعیت کو کمزور کیا جائے۔ نواز شریف اقتدار کی دہلیز پر چڑھ چکے تھے، انہوں نے یہ کام بخوبی انجام دیا، جبکہ سندھ میں جنرلوں نے ایم کیو ایم کو جنم دے کر اُس سے یہ کام لیا، اور جمعیت کراچی سے لاہور اور فیصل آباد تک شہیدوں کے جنازے اٹھا رہی تھی۔ جمعیت کی قیادت جیلوں میں ٹھونس دی گئی، یہاں تک کہ امیر العظیم کو پولیس نے تشدد کا نشانہ بنایا۔ ان کی زخمی حالت میں تصویر مجیب الرحمٰن شامی کے جریدے میں شائع ہوئی۔ لاہور میں صدر جنرل ضیاء الحق کی پریس کانفرنس تھی جن کا تاثر دھیمے و نرم لہجے میں بات کرنا مشہور تھا، انہیں توجہ دلاتے ہوئے جب میڈیا نے امیر العظیم کی تصویر دکھائی تو وہ سخت لہجے میں بولے ”امیر العظیم ہوں یا امیر العظم کسی کے ساتھ رعایت نہیں ہوگی“۔ پھر یہی کچھ ہوا، پشاور سے لے کر کراچی وحیدر آباد تک گرفتاریاں ہوئیں، کوڑوں کی سزا بھی سنائی گئی جس پر عمل نہیں ہوا، تاہم راقم سمیت سیکڑوں کارکنان جیلوں میں کئی کئی ماہ قید رہے اور ضمانتوں پر رہا ہو کر کئی سال تک عدالتوں کے چکر کاٹتے رہے۔

عظیم بھائی ملنسار اور دردِ دل رکھنے والے انسان تھے۔ جون 1990ء میں میری شادی ہوئی تو ہم لاہور گئے۔ ریلوے اسٹیشن سے منصورہ ہمیں محترم قاضی حسین احمد کی لینڈ کروزر میں لے جایا گیا جہاں چودھری صفدر مرحوم کے صاحب زادے نے حجلہ عروسی کی طرح ایک کمرے میں ہمارے ٹھہرنے کا اہتمام کیا۔ ان کے گھر عشائیہ بھی تھا۔ جبکہ امیر العظیم بھائی نے بھی اپنے گھر پُرتکلف دعوت دی۔ امیر العظیم بھائی جب حیدر آباد آتے، میرے غریب خانے کو بھی رونق بخشتے تھے، اور میری طبیعت و دکھ درد کو بھی سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جنرل پرویز مشرف کے دور میں لاہور میں ’شام کے بھٹیاں‘ کے مقام پر کل پاکستان اجتماعِ اراکین ہوا تو عظیم بھائی حیدر آباد کے کیمپ آئے اور مجھے رات قیام وطعام کے لیے اپنے دولت کدے پر لے گئے۔ یہاں دوسرے مہمان پروفیسر آف جنرل سرجری ڈاکٹر عبداللہ متقی (کراچی) تھے۔ صبح لبرٹی پر انہوں نے لاہور کا روایتی ناشتہ کرایا۔ ان کی یہ محبت میں کبھی بھول نہیں سکوں گا۔

عظیم بھائی اپنے خاندان میں دوسرے نمبر پر تھے۔ ان کے بڑے بھائی نور العظیم اور دو چھوٹے اشرف العظیم اور اسد العظیم ہیں، جبکہ انہوں نے بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی اور چار بیٹے منیب العظیم، شہیر العظیم، فصیح العظیم اور روجیہ العظیم کو بھی سوگوار چھوڑا ہے۔ وہ اشتہارات کے کاروبار سے بھی منسلک تھے۔ میڈیا مالکان سے لے کر عام صحافیوں تک روابط تھے۔ جیو کے سہیل وڑائچ کی شادی میں عظیم بھائی پیش پیش تھے، اور حسن نثار کی بیٹی کا نام ’محمدہ‘ رکھا۔ یہ کام انہوں نے بحیثیت سیکریٹری اطلاعات و نشریات کیا۔ تاہم جب سیکریٹری جنرل کی ذمہ داری آئی تو آخری سانس تک اپنی ذمہ داری سے وفا کرتے رہے۔ سرکلرز اور فون کے ذریعے ہر نظم سے رابطہ رکھا اور امیر جماعت اسلامی پاکستان حافظ نعیم الرحمٰن کی مکمل معاونت کی۔

ہر چند زندگی کی قدریں بدل گئیں
اہلِ وفا سے اب بھی خالی نہیں زمانہ

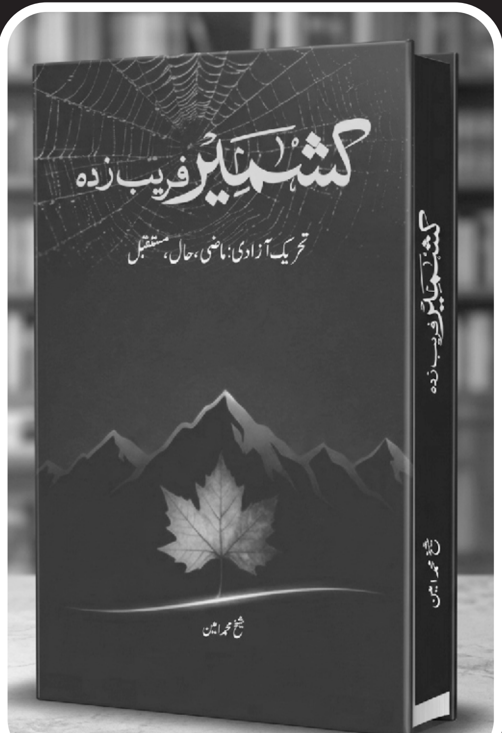

کشمیر فریب زدہ

- کشمیر ایک ایسا مسئلہ ہے جسے برسوں سے مختلف زاویوں سے دیکھا اور دکھایا جاتا رہا ہے۔
- ہم جو سنتے اور سمجھتے ہیں، کیا وہی پوری حقیقت ہے؟
- یا کچھ ایسے پہلو بھی ہیں جو ہماری نظروں سے اوجھل رہے ہیں؟
- ”کشمیر فریب زدہ“ ایک سنجیدہ تحقیقی کاوش ہے جو انہی سوالات کے مدلل اور فکر انگیز جواب پیش کرتی ہے۔
- ”کشمیر فریب زدہ“ ایک منفرد تحقیقی تصنیف ہے جو کشمیر کے تاریخی، سیاسی اور فکری پہلوؤں کا گہرائی سے جائزہ پیش کرتی ہے۔
- اگر آپ کشمیر کے مسئلے کو محض خبروں کی حد تک نہیں بلکہ تاریخی شعور اور حقیقت پسندانہ زاویۂ نظر سے سمجھنا چاہتے ہیں! تو ”کشمیر فریب زدہ“ آپ کے مطالعے کے لیے ایک نہایت اہم کتاب ہے۔

قیمت: 850 روپے
کشمیر ریسرچ اکیڈمی اسلام آباد

Jazzcash:
03320128138
Sheikh Abdul Momin
UBL Bank:
1657297825881
Sheikh Muhammad Amin

امیر العظیم بہت یاد آؤ گے

محمد مہدی

زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ نہیں کہ انسان رخصت ہو جاتا ہے، بلکہ یہ ہے کہ کچھ شخصیتیں اپنے ساتھ ایک پورا عہد بھی لے جاتی ہیں۔ چند ہی ماہ کے مختصر وقفے میں زعیم قادری، سردار ذوالفقار کھوسہ، الطاف حسن قریشی اور اب امیر العظیم اس سرزمین کی حدود سے نکل کر اس ملکِ عدم کے مسافر بن گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ یہ چاروں اپنی اپنی جگہ نگینہ تھے، اور میری خوش قسمتی رہی کہ ان سب سے ان کی زندگی کے آخری لمحوں تک محبت، احترام اور اپنائیت کا رشتہ قائم رہا۔ امیر العظیم سے بیماری کے ایام میں آخری بار فون پر گفتگو ہوئی۔ مرض ایسا تھا کہ اس کا نام سن کر ہی انسان کے حوصلے جواب دینے لگتے ہیں، مگر دوسری طرف ان کی آواز تھی جس میں نہ شکوہ تھا، نہ خوف، نہ مایوسی۔ صرف صبر، استقامت اور اللہ پر کامل بھروسے کی روشنی جھلک رہی تھی۔ انہوں نے بیماری کا مقابلہ جرأت سے کیا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ قاضی حسین احمدؒ نے منصورہ میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی۔ مجھے بھی دعوت دی۔ ایک روز فون کال موصول ہوئی دوسری جانب امیر العظیم تھے، مجھے اے پی سی میں شرکت اور تقریر کرنے کی دعوت دی، یہ میرا ان سے پہلا رابطہ تھا، اسی اجتماع میں پہلی مرتبہ امیر العظیم سے ملاقات ہوئی، ایک نہایت خوش اخلاق، منکسر المزاج اور دل آویز شخصیت سے ملاقات۔ پہلی ہی نشست میں طے ہوا کہ چند روز بعد تفصیلی ملاقات ہوگی۔ پھر لاہور ہائیکورٹ کے بالمقابل ایک ریسٹورنٹ میں وہ ملاقات ہوئی، اور یوں جو تعلق قائم ہوا وہ وقت کے ساتھ کم نہیں بلکہ محبت، اعتماد اور خلوص کی نئی منزلیں طے کرتا چلا گیا۔ سن 2013ء کے عام انتخابات، میں ممکنہ امیدواروں میں میرا نام بھی شامل تھا۔ نواز شریف صاحب نے اپنی قومی اسمبلی کی نشست کے نیچے صوبائی نشست پی پی 140 سے انتخاب لڑنے کے حوالے سے گفتگو فرمائی، شہباز شریف صاحب نے یہ رائے دی کہ مجھے نیچے لانے کے بجائے حکومت میں بہتر موقع دیا جائے۔ انہی دنوں امیر العظیم کا فون آیا۔ انہوں نے بڑی محبت سے کہا کہ اگر آپ انتخاب لڑیں گے تو میں آپ کی حمایت کروں گا۔ سیاست میں اختلافات بہت دیکھے، مگر دلوں کی ایسی وسعت کم ہی نصیب ہوتی ہے۔ جب بنگلہ دیش میں حسینہ واجد کی حکومت نے 1971ء کے دردناک واقعات کا بہانہ بنا کر وہاں کے سیاسی قائدین اور کارکنان کے خلاف خون آشام کارروائیاں شروع کیں تو امیر العظیم نے مجھ سے رابطہ کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ بیٹھ کر غور کیا جائے کہ اس نازک صورتِ حال میں ان مظلوموں کی کس طرح مدد کی جا سکتی ہے۔ اس مقصد کیلئے ایک نشست ہوئی جس میں امیر العظیم، جماعت اسلامی کے شعبۂ خارجہ امور کے سربراہ عبدالغفار عزیز اور میں شریک ہوئے۔ ان کی فکر صرف اپنی جماعت تک محدود نہ تھی، بلکہ جہاں بھی ظلم ہوتا، ان کا دل وہاں دھڑکتا تھا۔ ایک اور منظر آج بھی نگاہوں کے سامنے تازہ ہے۔

جرمن سفارت کاروں کے ساتھ میں نے ایک گروپ ڈسکشن کا انعقاد کیا تھا جیسا کہ میں اکثر و بیشتر کرتا رہتا ہوں۔ اس گروپ ڈسکشن میں، میں نے شرکت کی دعوت سردار ذوالفقار کھوسہ، زعیم قادری، امیر العظیم کو دی تھی اور بھی کچھ احباب میں نے مدعو کر رکھے تھے۔ امیر العظیم اکثر میری دعوت پر ایسی علمی و سیاسی نشستوں میں شریک ہوتے تھے۔ یہ 2002 کے ضمنی انتخابات کا وقت تھا۔ اس گروپ ڈسکشن کے دوران زعیم قادری کو ایک فون کال موصول ہوئی۔ دوسری طرف سے انہیں پارٹی قیادت نے بتایا کہ وہ انتخاب سے دستبردار ہو جائیں کیونکہ یہ نشست امیر العظیم کو دے دی گئی ہے۔ اس لمحے موجود یہ تینوں گواہ آج اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ وقت نے اس منظر کے ان نگینوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ بس یادیں رہ جاتی ہیں۔ امیر العظیم نے میری والدہ کے چہلم میں شرکت کی۔ چہلم کے موقع پر وہ سب سے پہلے آنے والوں میں تھے اور سب سے آخر میں رخصت ہوئے۔ یہ محض رسمی شرکت نہ تھی، بلکہ رفاقت، محبت اور اخلاص کا ایسا اظہار تھا جو لفظوں سے زیادہ دل میں محفوظ رہتا ہے۔ جماعتی منصب، سیاسی مقام اور عوامی شناخت کے باوجود تکبر ان کے قریب بھی نہ پھٹکا تھا۔ ان کی طبیعت میں انکسار تھا، گفتگو میں شائستگی تھی اور تعلقات میں خلوص۔ آج ایک اور نگینہ خاک اوڑھ کر سو گیا، لیکن ایسے لوگ مٹی میں دفن نہیں ہوتے، وہ اپنی خوشبو اپنے کردار، اپنے اخلاق اور اپنی محبتوں میں چھوڑ جاتے ہیں۔ یہی خوشبو آنے والے زمانوں تک ان لوگوں کے دلوں کو معطر کرتی رہے گی جنہیں کبھی ان کی رفاقت نصیب ہوئی۔

امیر العظیم نے میری والدہ کے چہلم میں شرکت کی۔ چہلم کے موقع پر وہ سب سے پہلے آنے والوں میں تھے اور سب سے آخر میں رخصت ہوئے۔ یہ محض رسمی شرکت نہ تھی، بلکہ رفاقت، محبت اور اخلاص کا ایسا اظہار تھا جو لفظوں سے زیادہ دل میں محفوظ رہتا ہے۔ جماعتی منصب، سیاسی مقام اور عوامی شناخت کے باوجود تکبر ان کے قریب بھی نہ پھٹکا تھا۔ ان کی طبیعت میں انکسار تھا، گفتگو میں شائستگی تھی اور تعلقات میں خلوص۔

روح العظیم، امیرالعظیم، امیرالعظیم

مصطفیٰ کمال پاشا

اللہ رب العزت جب کسی سے خوش ہوتا ہے، راضی ہوتا ہے تو وہ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے کہ جاؤ لوگوں کو بتاؤ کہ یہ اللہ رب العزت کا پسندیدہ بندہ ہے۔ فرشتے اس شخص کے ہم نفسوں کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہیں کہ یہ شخص اللہ کا پسندیدہ بندہ ہے۔ اس شخص کے ہم نواؤں کو القا کیا جاتا ہے کہ یہ اللہ کا پسندیدہ بندہ ہے۔ اللہ اس سے راضی ہے، تم بھی راضی ہو جاؤ۔ پھر اس شخص کے بارے میں اچھا ہونے کا تصور قائم ہونے لگتا ہے۔ معاشرے میں اس کی شرافت اور پاکیزگی کی باتیں ہونے لگتی ہیں۔ ہمارے ہمدم دیرینہ امیرالعظیم ایسے ہی نفوس کریم وحمیدہ میں سے تھے۔ ان کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ "عظیم بھائی اچھے ہیں" انہیں ملنے والا ہر شخص ان کا گرویدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ وہ جس سے بھی ملتے اس پر نفس کا تاثر چھوڑ جاتے۔ وہ اپنے دوستوں کے لئے اطمینان وطاقت کا نشان ہی نہیں بہت بڑی سورس تھے۔ جنت دوزخ کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن اگر کسی کے بارے میں تعوذ کیا جا سکتا ہے۔ سوچا جا سکتا ہے اور توقع کی جا سکتی ہے کہ اللہ رب کریم اسے جنت الفردوس میں جگہ ضرور دے گا۔ کسی شخص کی دنیوی زندگی کی پاکیزگی اور خشیت اللہ دیکھ کر توقع کی جا سکتی ہے کہ اللہ رب کریم اس نفس کو یقینا جنت الفردوس میں جگہ دے گا تو امیرالعظیم ایسے ہی نفوس کریم میں شامل ہوں گے جو اللہ کی رضا سے یقینا جنت الفردوس میں مکین ہوں گے۔ جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی فکر کی تشکیل ہے جس کا مقصد قیام نظام اسلام ہے اور اس مقصد کے لئے ایسے مردان کار پیدا کرنا ہے جو اسوۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق اپنی زندگیاں گزاریں۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے راستوں پر چلیں۔ جماعت اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ ایک طرف فرد کی سیرت وکردار کی تشکیل میں مددگار ہوتا ہے۔ دوسری طرف نظم اجتماعی کے ذریعے افراد کو ایک موثر قوت بناتا ہے۔ امیرالعظیم جماعت کی اس پالیسی کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ جماعت اسلامی کے مرکزی رہنماؤں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ایک عرصہ تک وہ جماعت اسلامی کے مرکزی شعبہ نشر و اشاعت کے سیکرٹری رہے۔ اپنی اس حیثیت میں انہوں نے جماعت اسلامی کے صاف وشفاف چہرے کو عامۃ الناس میں متعارف کرایا۔ نشر و اشاعت کے چھوٹے بڑے مراکز، میڈیا ہاؤسز، رائے عامہ کی تشکیل کرنے والے اصحاب، میڈیا ہاؤسز اور موثر افراد کے ساتھ ان کے قریبی رابطے قائم رکھے۔ لوگ کسی بھی جماعت یا پارٹی کا منشور یا لٹریچر پڑھ کر ہی اس کے بارے میں رائے قائم نہیں کرتے بلکہ اس جماعت یا پارٹی کے ذمہ داران کے ساتھ میل ملاقات، بات چیت اور عمومی روابط کے ذریعے اس پارٹی کے بارے میں رائے قائم کرتے ہیں۔ امیرالعظیم ایک ایسی پرکشش شخصیت کے مالک تھے کہ جو بھی ان سے ملتا وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا اور جس کے ساتھ وہ خود ملتے اسے اپنا بنا لیتے تھے۔ وہ چلتی پھرتی جماعت اسلامی تھے۔ جماعت اسلامی کے کٹر مخالفین بھی نظریاتی طور پر دشمن بھی امیرالعظیم کی شخصیت سے متاثر ہوتے تھے۔ امیرالعظیم ہمہ وقت کسی بھی فرد کی دادرسی اور مدد کے لئے تیار رہتے تھے۔ بلاتفریق رنگ ونسل اور فکر وعمل وہ لوگوں کے مسائل کے حل کے لئے مستعد نظر آتے تھے۔ لوگ ان سے مل کر اپنے نجی وگھریلو معاملات میں بھی مشورہ طلب کر لیا کرتے تھے۔ یہ بات میں ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ امیرالعظیم کو اللہ رب العزت نے صبر وتحمل کے ساتھ کسی کی بات سننے کی صلاحیت عطا کی تھی۔ وہ کسی کو بات کرتے ہوئے ٹوکتے نہیں تھے۔ بات سنتے، تسلی سے سنتے اور پھر جب مخاطب چپ کرتا تو اسے جواب دیتے۔ ویسے اللہ نے فطری طور پر انسان کو سننے کے لئے دو کان اور بولنے کے لئے ایک زبان عطا کی ہے۔ فطرت کا منشا یہی نظر آتا ہے کہ زیادہ سنا جائے اور کم بولا جائے۔ امیرالعظیم فطرت پر گامزن تھے۔ زیادہ سنتے اور کم بولتے تھے۔ ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ سننے والے کے لئے تسلی وتشفی کا باعث بنتا تھا۔ امیرالعظیم سے ہماری یاد اللہ اس وقت سے ہے جب وہ اسلامیہ کالج میں بی ایس سی کے طالبعلم اور ہم ایف ایس سی میں پڑھتے تھے۔ آپ علاقہ شرقی کے ناظم تھے اور ہم حلقہ میاں میر کے ناظم۔ بطور ناظم علاقہ شرقی امیرالعظیم جب ہمارے گھر تشریف لائے تو ہماری اماں جی کھل اٹھتیں کہ میرے بیٹے کا دوست آیا ہے۔ انفرادی ملاقات کے دوران اذان ہو جاتی تو امیرالعظیم ہمیں نماز باجماعت کے لئے مسجد لے جاتے۔ نماز پڑھتے ہوئے امیرالعظیم اپنے اردگرد سے مکمل طور پر کٹ جاتے اور پورے انہماک کے ساتھ اپنے رب کے حضور پیش رہتے۔ خشوع وخضوع کے ساتھ نماز کی ادائیگی کرتے۔ اس دور سے قائم ہونے والا تعلق گزشتہ روز ان کے جنازے تک قائم رہا۔ ہم آخری وقت تک سمجھتے رہے کہ ہم ان کے لئے "انتہائی اہم شخصیت" ہیں۔ فیوچر وژن کے قیام اور پھر گارڈن ٹاؤن منتقلی تک ان کے ساتھ برادرانہ تعلق قائم رہا۔ مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ جب انہوں نے گارڈن ٹاؤن میں دفتر قائم کرنے کے لئے موجودہ عمارت خریدی تو ہمیں اس کا وزٹ کرایا۔ جب سپیشل ٹی وی قائم کیا تو ہمیں اس میں پروگرام کرنے کی دعوت دی۔ ہم نے بھی ریکارڈنگ کے طے شدہ شیڈول سے کبھی روگردانی نہیں کی۔ ہمارے اب تک 500 سے زائد پروگرام نشر ہو چکے ہیں۔ انہوں نے یعنی امیرالعظیم نے ہمیں اپنا یوٹیوب چینل بنانے کی دعوت بھی دی اور اس کے لئے فنی وتکنیکی معاونت بھی فراہم کی۔ امیرالعظیم ایک چلتی پھرتی تحریک اسلامی تھے۔ ایک صالح اور پاکباز روح تھی، جس نے جی بھر کر زندگی بیتائی۔ توشہ آخرت کے حصول کے لئے، رب کریم کی رضا کے حصول کے لئے مادی زندگی کو بھرپور انداز میں استعمال کیا۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ جی بھر کر جیا۔ امیرالعظیم نے اپنی جماعت کو امر کیا اور خود بھی امر ہو گیا۔ اللہ رب کریم اس پاک روح کو جنت الفردوس میں جگہ دے گا، ضرور دے گا۔ میری نہیں ہزاروں لاکھوں انسانوں کی التجا ہے دعا ہے گزارش ہے کہ اللہ انہیں اپنے حبیب کے صدقے جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

نہیں چل پائیں گے!!

احمد عبداللہ

رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ میں چند جمعیت کے ساتھیوں کے ہمراہ اعتکاف میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک دن خبر ملی : حافظ نعیم الرحمٰن صاحب امیرِ جماعت منتخب ہو گئے ہیں۔ایک طرف دل خوشی سے بھر گیا، دوسری طرف امید کا ایک نیا چراغ بھی روشن ہوا۔مگر اسی کے ساتھ کئی سوالات بھی

ذہن میں جنم لینے لگے۔ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ قیمِ جماعت کون ہوں گے؟ کئی نام ذہن میں آئے، جن میں امیر العظیم صاحب کا نام بھی شامل تھا۔لیکن ساتھ بیٹھے ایک ساتھی نے فوراً کہا: بھائی! عظیم صاحب بہت سینئر ہیں، حافظ صاحب کے ساتھ نہیں چل پائیں گے۔اس وقت یہ بات مجھے بھی کچھ بعید نہ لگی۔آخر حافظ نعیم صاحب، امیر العظیم صاحب سے نظامتِ اعلیٰ کے منصب پر بھی تقریباً دو دہائیاں جونیئر رہے تھے۔حافظ صاحب نے یقیناً ہمیشہ انہیں ایک بڑے، مربی، رہنما اور اپنے محسن کے طور پر ہی دیکھا ہوگا۔ان کے تجربات سے سیکھا ہوگا، ان کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا ہوگا، اور شاید کبھی یہ تصور بھی نہ کیا ہوگا کہ ایک دن انہیں اسی تحریک کی قیادت کرنا ہوگی جس کے صفِ اوّل کے داعیوں میں امیر العظیم صاحب جیسی شخصیت موجود ہوگی۔ چند دن بعد خبر آئی کہ امیر العظیم صاحب ہی قیمِ جماعت ہوں گے۔اس لمحے بے اختیار خیال آیا کہ یہ مرحلہ ان کے لیے کتنا مشکل ہوگا۔مگر پھر جو منظر دیکھا، اس نے زندگی بھر کے لیے ایک سبق دے دیا۔مرکزی شوریٰ کے اجلاس کی پہلی تصویر سامنے آئی تو امیر العظیم صاحب، امیرِ جماعت کے پہلو میں اسی محبت، وقار، خلوص اور اطاعت کے ساتھ موجود تھے، جیسے ہمیشہ رہے تھے۔ نہ چہرے پر کوئی شکوہ، نہ دل میں کوئی تردد، نہ منصب کا احساس، نہ عمر اور تجربے کا غرور۔بس ایک کارکن... ایک داعی... ایک سچا سپاہی۔اس لمحے محسوس ہوا کہ تحریکیں اصولوں پر چلتی ہیں، شخصیات پر نہیں۔امیر العظیم صاحب نے اپنے عمل سے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے اس تصور کو مجسم کر دیا کہ تحریک میں شخصیات کی حیثیت بس ایک مزدور کی سی ہوتی ہے؛ جہاں، جب اور جس ذمہ داری پر لگا دیا جائے، وہ بغیر کسی تردد کے اپنا فرض ادا کرتا ہے۔کیونکہ اصل مقصد اپنا نام نہیں، اللہ کے دین کا غلبہ ہوتا ہے۔آج امیر العظیم صاحب ہم سے

امیر العظیم صاحب نے اپنے عمل سے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے اس تصور کو مجسم کر دیا کہ تحریک میں شخصیات کی حیثیت بس ایک مزدور کی سی ہوتی ہے جہاں، جب اور جس ذمہ داری پر لگا دیا جائے، وہ بغیر کسی تردد کے اپنا فرض ادا کرتا ہے۔کیونکہ اصل مقصد اپنا نام نہیں، اللہ کے دین کا غلبہ ہوتا ہے۔

رخصت ہو گئے ہیں۔ہر آنکھ اشک بار ہے، مگر ہر زبان ان کی دیانت، امانت، اخلاص اور وفاداری کی گواہی دے رہی ہے۔انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، ہر پہلو اپنی مثال آپ تھا۔ جوانی سے آخری سانس تک تحریک سے ایسی وابستگی نبھائی جو آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہے اور صرف تحریک ہی نہیں... وہ دوستوں کے بھی دوست تھے۔حافظ سلمان بٹ ہوں، عبدالغفار عزیز صاحب ہوں یا کوئی عام کارکن، ہر ایک کے لیے ان کے دروازے، ان کا وقت اور ان کا دل ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔چند روز قبل میاں مقصود صاحب کے جنازے کے بارے میں اباجی نے بتایا کہ شدید گرمی اور علالت کے باوجود امیر العظیم صاحب وہاں موجود تھے۔تب دل میں یہی شعر گونجا:

اس سے پہلے کہ کسی رسم پہ وارے جائیں
چل کسی خواب کی تکمیل میں مارے جائیں

امیر العظیم صاحب سے میری ملاقاتیں زیادہ نہیں رہیں، مگر جتنی بھی ہوئیں، ہر بار ان کی شفقت، عاجزی اور محبت نے دل جیت لیا۔وہ ہر شخص کو اس طرح گلے لگاتے کہ سامنے والے کو محسوس ہوتا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔آج ان کی جدائی صرف ایک شخصیت کی جدائی نہیں، بلکہ اخلاص، انکساری، اطاعت اور وفا کے ایک روشن باب کا اختتام محسوس ہوتی ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ رخصت نہیں ہوتے۔وہ اپنے کردار، اپنی مثال اور اپنے اخلاق کی صورت میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ امیر العظیم صاحب کی کامل مغفرت فرمائے، ان کی قبر کو نور سے بھر دے، درجات بلند فرمائے، ان کی تمام دینی و تحریکی خدمات کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے، اور ہمیں بھی ان جیسا اخلاص، اطاعت، عاجزی اور استقامت نصیب فرمائے۔

آمین یارب العالمین۔

آہ...! امیرالعظیم
بچپن کا دوست اور محسن بھی!

علی احمد ڈھلوں

امیر العظیم کی صورت میں جماعت اسلامی کا ایک عہد ختم ہوگیا، ویسے تو زندگی فانی ہے، سبھی نے موت کا مزہ چکھنا ہے، مگر کچھ شخصیات کی رحلت صرف ایک فرد کی موت نہیں ہوتی، ایک عہد کے اختتام کا احساس بھی اپنے ساتھ لے آتی ہے۔ وہ لوگ جو اپنی پوری زندگی کسی نظریے، کسی مقصد اور کسی اجتماعی خواب کے لیے وقف کر دیتے ہیں، ان کا دنیا سے رخصت ہونا محض ان کے اہلِ خانہ یا جماعت کا نقصان نہیں ہوتا بلکہ قومی زندگی میں ایک ایسی خاموشی چھوڑ جاتا ہے جسے مدتوں محسوس کیا جاتا ہے! وہ میرے محسن بھی تھے، بڑے بھائی بھی تھے اور رہنما بھی تھے، اُن کے جانے کے بعد مجھے ایسے لگ رہا ہے، جیسے میرے جسم سے میرا ایک بازو کٹ گیا ہے، کیوں کہ مجھے جب بھی اُن کی ضرورت محسوس ہوئی تو مجھے علم تھا کہ وہ اُن کی شکل میں میرا ایک ساتھی لاہور میں موجود ہے اور ہمارا ساتھ کوئی نیا نہیں بلکہ بہت پرانا اور چند دہائیوں پر مشتمل تھا، یعنی امیر العظیم، میرے بچپن کے ساتھی، میرے سکول فیلو اور یونیورسٹی کے رہنما واقعی عظیم تھے۔ وہ اسلامیہ سکول سنت نگر میں مجھ سے ایک سال سینئر تھے۔ لیکن ہم دوست اس لیے تھے کہ ہم سکول "اسکاوٹس" میں بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ اُن کے بڑے بھائی نور العظیم، میرے بڑے بھائی آفتاب احمد ڈھلوں کے کلاس فیلو تھے۔ ہماری دوستی وہیں سکول سے شروع ہوئی اور اُن کی رحلت تک قائم رہی۔ سکولنگ کے بعد میرا داخلہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوا تو اُس وقت میں "اینٹی جمعیت" تھا جبکہ امیر العظیم کالج لائف میں بھی اسلامی جمعیت طلبہ کے سرکردہ رہنماؤں میں شامل ہو گئے تھے۔ اُس وقت میرے جمعیت والوں سے اکثر جھگڑے ہوتے رہتے تھے تو موصوف ہی صلح کروانے والوں میں سب سے آگے ہوتے تھے اور کہا کرتے تھے "علی پنگے مت لیا کرو" تو میں اکثر کہا کرتا کہ بھائی مجھے پتہ ہے۔ میرا بڑا بھائی جب تک ہے، مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں ہے۔ خیر اُس وقت نوجوانی میں بڑے بڑے ڈائیلاگ بھی بول لیا کرتے تھے اور باتیں ہنسی مذاق میں اُڑا لیا کرتے تھے۔ ہم اکثر کیفے میں اکٹھے ہوتے تو میں نے محسوس کیا کہ امیر صاحب کبھی کبھی میرے ساتھ کیفے میں بیٹھنے سے ہچکچایا کرتے تھے اور کبھی کبھی ہم دوستوں کی محفل سے اُٹھ کر چلے جایا کرتے تھے۔ میں نے ایک دن اُن سے پوچھ ہی لیا کہ امیر صاحب خیر ہے۔ آپ اکثر جلدی میں ہوتے ہیں؟ تو کہتے ہیں کہ یار! میری جمعیت والے آپ کے ساتھ بیٹھنا مناسب نہیں سمجھتے لیکن میں پھر بھی آجاتا ہوں کہ آپ ناراض نہ ہو جاؤ۔ وہ اکثر مجھے جمعیت میں آنے کی "دعوت" بھی دیتے۔ لیکن میں کہا کرتا تھا، امیر بھائی! میرا مزاج آپ کی جماعت میں آنے کے قابل نہیں! وہ ہنس دیتے اور میرے شرارتی پن کی وجہ سے بات ہوا میں اُڑا دیتے اور ویسے بھی جب آپ سکول کی تعلیم مکمل کر رہے ہوتے ہیں تو آپ پختگی کی عمر کو پہنچ رہے ہوتے ہیں۔ آپ نوبلوغیت میں بڑوں سے سیکھتے بھی ہیں، چیزوں کو پرکھتے بھی ہیں، شرارتیں بھی کرتے ہیں، اور اُنہی شرارتوں کی بدولت آپ اپنی تربیت بھی کرتے ہیں اور اچھے برے میں تمیز بھی کرتے ہیں۔ خیر وقت گزرتا گیا، پھر میرا داخلہ ماسٹر ڈگری کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں ہوگیا اور یہاں امیر العظیم پہلے سے ہی براجمان تھے، یعنی پنجاب یونیورسٹی طلباء یونین کے منتخب صدر رہے، بعدازاں اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم اعلیٰ کے طور پر فرائض سرانجام دیے۔ لہٰذا میرے یہاں بھی وہی "مسئلے" یعنی طلبہ تنظیموں کے رولے تھے اور انہی مسائل میں میرا ایک بار پھر جمعیت کے عہدیداران کے ساتھ جھگڑا ہوگیا اور یہاں تو پہلے سے ہی اسلامی جمعیت طلبہ کا طوطی بولتا تھا اس لیے مجھے یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ میں اپنے بڑوں کو ان مسائل کے بارے میں آگاہ کرنا "گناہ" سمجھتا تھا۔ کیوں کہ ان کو بتانے سے معذرت کے ساتھ میرے مسئلے حل نہیں ہوتے تھے بلکہ بڑھ جاتے تھے کیوں کہ اُنہوں نے یونیورسٹی چھڑوا کر یا تو گھر بٹھا دینا تھا یا یونیورسٹی آ کر میری ہی درگت بنانی تھی۔ اس لیے میں اندر ہی اندر پریشان ضرور تھا کہ یونیورسٹی میں کیسے بحالی ہو اور الحمدللہ یہاں بھی امیر العظیم ہی کام آئے! انہوں نے مجھے وائس چانسلر کے کمرے میں بلایا اور ساتھ تنظیم کے عہدیداران کو بلایا اور کچھ شرائط پر ہماری صلح کروائی اور اس طرح جامعہ پنجاب یونیورسٹی میں میری دوبارہ بحالی ہوئی۔

قصہ مختصر کہ میں ایک شریر طالب علم تھا اور امیر العظیم نفیس اور سادہ طبیعت کے رہنما۔ وہ ہمیشہ مجھے تصادم سے بچاتے تھے لیکن یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ وہ اتنے بھی سادہ طبیعت کے نہیں تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے جنرل ضیاءالحق کے دور میں بھرپور مزاحمت دکھائی تھی۔ یعنی زمانہ طالب علمی میں امیر العظیم نے ضیاءالحق دور میں طلبہ یونین کی بحالی کے لیے لانگ مارچ کیا اور اس کے لیے جیل کی صعوبتیں برداشت کیں، اسی قید کے دوران اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم اعلیٰ کے طور پر انہیں منتخب کر لیا گیا۔ تبھی جنرل ضیاءالحق نے 1984ء میں کہا تھا کہ "کوئی امیر العظیم ہو یا امیر الاعظم، میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا" (حوالہ جنگ اخبار)۔ اس خبر کا پس منظر بتاتا چلوں کہ 10 فروری 1984ء کو طلبہ یونینز پر پابندی کے بعد ملک بھر میں طلبہ تنظیموں نے سرکار کو خاصا ٹف ٹائم دیا تھا، اس تحریک میں سب سے توانا اور دبنگ طلبہ رہنما امیر العظیم ہی تھے۔ اُن کی ایک کال پر ہزاروں طلبہ سڑکوں پر نکل آتے تھے۔ حکومت پر دباؤ ڈالتے تھے، ایک بار تو اس قدر دباؤ ڈالا کہ صدر ضیاءالحق مذکورہ بالا جملہ کہنے پر مجبور ہوگئے۔ جیلیں بھی کاٹیں بلکہ انہوں نے ایم اے پولیٹیکل سائنس بھی کوٹ لکھپت جیل ہی سے کیا۔ جیسے ہی 1988ء میں جنرل ضیاء کا دور اُن کے طیارہ کریش ہونے پر ہوا، اُن کا سفر بھی اسلامی جمعیت طلباء سے ختم ہوگیا اور جماعت اسلامی میں آ گئے۔ پھر میں نے جب عملی زندگی (صحافت) میں قدم رکھا تو جماعت اسلامی اُس وقت پاکستان کی دوسری یا تیسری بڑی جماعت سمجھی جاتی تھی۔ اُس کا ایک احتجاج حکومت کو ہلا کر رکھ دیتا تھا۔ میرے لیے امیر العظیم جماعت اسلامی کے اندر خبروں کا سب سے بڑا "سورس" ہوا کرتے تھے۔ جب بھی کبھی سرکار اور جماعت اسلامی کے حالات خراب ہوتے یا کہیں

مذاکرات ہو رہے ہوتے تو میں اُن کے پاس پہنچ جاتا۔ وہ بھی بڑے سیانے تھے۔ مجھے انکار تو وہ کرنہیں سکتے تھے۔ لہٰذا "اندر کی خبر" دینے کے بجائے مجھے کہتے کہ چلو آؤ میں تمہیں فلاں کا انٹرویو دلوا دیتا ہوں۔ وہ شائع کر دینا اُن سے بہت سی "اندر کی خبریں" مل جائیں گی! میری صحافت بھی نئی نویلی دلہن کی طرح بالکل پاکیزہ تھی۔ میں بھی اکثر اُن کی باتوں میں آجاتا، کبھی کبھی باتوں باتوں میں اُن سے اندر کی خبر نکلوا کر اگلے دن شائع کر دیتا۔ پھر امیر صاحب کے فون کا "انتظار" کرتا، کبھی کبھی تو وہ فون کر دیتے کہ یار! یہ بات میں نے آف دی ریکارڈ بتائی تھی تم نے شائع کر دی، میں کہا کرتا تھا کہ امیر بھائی جس بات میں قوم کا بھلا ہو رہا ہو وہ "آف دی ریکارڈ" نہیں رہتی! بسا اوقات وہ بھی میری باتوں میں آجایا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا اور پھر جب میں نے اپنا اخبار نکالا تو اُن کا ایک فیکس موصول ہوا جس میں لکھا تھا "شکر ہے"۔ اب اس "شکر ہے" کا مطلب، مجھے علم نہیں تھا کہ یہ طنز تھا، حقیقی شکر تھا یا اُنہیں علم ہو چکا تھا کہ اب یہ بندہ "رپورٹنگ" نہیں کر سکے گا۔ کیوں کہ اب اس پر ایک بڑی ذمہ داری آن پہنچی ہے! میں نے اپنے آفس میں اُنہیں مدعو بھی کیا، اور پوچھا کہ شکر ہے کہ مطلب کیا ہے۔ اُنہوں نے ہمیشہ اس حوالے سے مذاق میں بات ٹال دی اور میں چاہ کر بھی اُن سے اس کی وجہ نہیں پوچھ سکا۔

خیر امیر العظیم طویل عرصہ جماعت اسلامی پاکستان کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات رہے۔ اس کے بعد جماعت اسلامی لاہور کے سیکرٹری جنرل اور امیر کے طور پر فرائض انجام دیے، بعد ازاں جماعت اسلامی وسطی پنجاب کے امیر کے طور پر خدمات نبھائیں۔ 2019ء میں اپنے دوسرے انتخاب کے بعد امیر جماعت اسلامی سراج الحق نے مرکزی مجلس شوریٰ کے مشورے سے امیر العظیم کو جماعت اسلامی پاکستان کا مرکزی سیکرٹری جنرل مقرر کیا۔ امیر العظیم نے وکلاء تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔ چیف جسٹس بحالی لانگ مارچ میں پولیس کی طرف سے پھینکا آنسو گیس شیل ان کے سر پر لگا تھا، جس سے وہ شدید زخمی ہو گئے، اس شیل سے لگے گہرے گھاؤ کا نشان ان کے ماتھے پر نمایاں رہا۔ 2002ء کے ضمنی انتخابات میں امیر العظیم نے لاہور کی صوبائی نشست پر متحدہ مجلس عمل کے پلیٹ فارم سے حصہ لیا۔ اس انتخاب میں ان کی اس وقت کے آمر پرویز مشرف کے زیر سایہ بننے والی حکمران جماعت کے امیدوار کے خلاف جاندار انتخابی مہم سے متاثر ہو کر مسلم لیگ نواز نے اپنا امیدوار امیر العظیم کے حق میں دستبردار کروا لیا، لیکن بدترین حکومتی دھاندلی کی بدولت امیر العظیم کی واضح جیت کو شکست میں بدل دیا گیا۔ اس کے علاوہ امیر العظیم "فیوچر ویژن کمیونیکیشن" کے چیف ایگزیکٹو تھے۔ انہوں نے میرے اخبار روزنامہ "لیڈر" اور "مقابلہ" کو خاصے اشتہارات بھی دیے۔ جس سے آفس کے مالی معاملات کو حل کرنے کا حوصلہ ملتا رہا۔ ہم نے جب جب اُنہیں اپنے آفس میں، کسی کتاب کی رونمائی میں، سالگرہ تقریبات میں، کسی فورم میں، یا کسی بھی سیمینار میں ہم نے اُنہیں جب جب مدعو کیا۔۔۔ وہ آئے۔۔۔ میرے خیال میں شاید ہی کوئی ایسا موقع ہو کہ جب ہم نے اُنہیں کسی فنکشن میں مدعو کیا ہو، اور وہ نہ آئے ہوں۔ لیکن اُن کے جانے سے میری زندگی میں جو خلاء پیدا ہوا ہے، اُسے پورا کرنا انتہائی مشکل ہے۔ وہ جب تک اسلامی جمعیت میں رہے میں گواہ ہوں کہ انہوں نے مکمل ایمانداری سے کام کیا، کبھی کسی سے زیادتی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اُن کے دیگر ساتھیوں کی طرف سے اگر کہیں زیادتی ہوئی بھی تو جمعیت میں احتساب کا نظام تھا۔ اس احتساب کے نتیجے میں لوگوں کی رکنیت تک ختم کر دی جاتی تھی، انھیں تنظیم سے نکال دیا جاتا تھا۔ بہر حال آج ہم اُن کے بغیر ہیں۔۔۔ اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ اُنہیں کروٹ کروٹ غریق رحمت فرمائے (آمین)

مین آف آل سیزن!

طارق رحمان

آج کے جین زیز تصور بھی نہیں کر سکتے جس طرح اسلامی جمعیت طلبہ نے 80 کی دھائی میں اس وقت کے آمر جنرل ضیاء الحق کے خلاف تن تنہا ایک عظیم الشان، منظم اور پاکباز تحریک چلائی تھی۔ ملک کی تقریباً ساری سیاسی قیادت ٹھنڈی ٹھار بیٹھی تھی بہت تیر مارا تو ایک آل پارٹیز کانفرنس کر کے فوٹو سیشن کرا لیا۔ ایسے میں جمعیت نے نعرہ مستانہ لگایا اور 1983-84 میں طلبہ تنظیموں پر پابندی کے خلاف ایک شاندار تحریک کی بنیاد رکھی۔ ہزاروں طلبہ گرفتار ہوئے، سینکڑوں کا اخراج ہوا اور درجنوں کو کوڑوں کی سزائیں ملیں اس تحریک کی کی صف اول کی قیادت میں امیر العظیم نامی ایک پاکباز، خوبصورت اور خوب سیرت نوجوان بھی شامل تھا۔ وہ اس وقت ناظم پنجاب تھے، اسی دوران گرفتار ہوئے اور جیل میں ہی انہوں نے نظامت اعلیٰ کا حلف پڑھا۔ دوران اسیری ان پر تشدد ہوا انہیں کوڑے لگائے گئے لیکن ان کے پائے استقامت میں لرزش نہیں آئی

امیر العظیم بھائی ضیاء آمریت کے خلاف جدو جہد کا استعارہ تھے۔

مزاجاً جنرل ضیاء ایک انتہائی ٹھنڈے اعصاب کے فرد تھے مشکل سے مشکل صورتحال میں بھی ہنستے کھیلتے جواب دے کر جان چھڑا لیا کرتے تھے۔ اپنے 11 سالہ دور میں میڈیا کے سامنے وہ صرف ایک بار آپے سے باہر ہوئے اور موضوع یہی ہمارے امیر العظیم بھائی تھے ہوا یوں کہ شامی صاحب نے قومی ڈائجسٹ کے سرورق پر امیر العظیم بھائی کی زخمی حالت میں تصویر چھاپ دی اس تصویر کی وجہ سے یہ رسالہ مارکیٹ میں شارٹ ہو گیا۔ بھری پریس کانفرنس میں کسی نے وہ رسالہ لہرا کر ضیاء الحق سے امیر العظیم بھائی پر تشدد کے حوالے سے سوال کر ڈالا جس پر آگ بگولہ ہو کر انہوں نے پھٹ پڑنے کے انداز میں کہا

"کوئی امیر العظیم ہو یا امیر المعظم... میں کسی کو نہیں چھوڑونگا"

اگلے دن یہ تمام اخبارات کی ہیڈنگ تھی

میری معلومات کے مطابق وہ آخری سٹوڈنٹ لیڈر تھے جن کو ملک گیر پذیرائی حاصل تھی۔ رہائی کے بعد مسجد خضراء میں جمعیت جنوبی کے اجتماع علاقہ میں ان کی تقریر سننے کا موقع ملا اور یہاں بھی واقعتاً انہیں یکتاء پایا۔ وہ اسی کی دھائی کے MBA تھے اور یہ ڈگری انہوں نے دوران اسیری حاصل کی تھی۔ وہ دلیل کی قوت اور جوش کا بہاؤ دونوں کا امتزاج تھے مطالعہ کے شوقین اور زبان کے دھنی۔ اوپر سے ان کی طویل اسیری اس بانجھ معاشرے میں ہمارے تو وہ ہیرو تھے۔ یہ بحیثیت ناظم اعلیٰ انہی کا وژن تھا کہ جمعیت کی حقوق طلبہ ریلی میں پہلی بار ساری ملکی قیادت بشمول جماعت اسلامی اور پیپلز پارٹی ایک سٹیج پر اکٹھی نظر آئیں جس سے ضیاء آمریت لرزہ بہ اندام ہوئی۔ احتجاجی تحریک ہو، تنظیمی تنازعہ ہو، اشتہاری مہم ہو، تربیتی نشست ہو، سیاسی جدو جہد ہو، شب بیداری ہو وہ "مین آف آل سیزن" تھے۔ بعد میں وہ جماعت اسلامی کے قیم رہے لیکن طویل بیماری آڑے آئی اور آج بالآخر انہوں نے جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ ترے گھر کی نگہبانی کرے

وہ نادر روزگار

ہارون الرشید

خواہش اور دعا یہ ہے کہ پروردگار امیر العظیم کو اپنے خاص بندوں میں شامل فرمالے۔ اقبال نے کہا تھا۔

ہو اگر خود گر و خود نگر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

پانی میں ڈوبے لاہور میں اس طرح خلق نے انہیں رخصت کیا۔ ہے کہ بائیدو شاید منصورہ کی وسیع وعریض مسجد دل زدوں سے بھر چکی تو صفیں باہر بھی بنائی گئیں۔

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے

پرسوں شب تیسرے پہر پروفیسر ضرار کا پیغام پہنچا: امیر العظیم چلے گئے۔ خبر ایسی تھی کہ یقین ہی نہ آیا۔ لیکن پھر ملال اترا اور یاد آگیا کہ موت کا سیاہ ہاتھ جب حرکت میں آتا ہے تو پہاڑ بھی بکھر جاتے ہیں۔ وہ تو گداز قلب کا ایک آدمی ہی تھا۔ ہمیشہ ہنستا مسکراتا، جی دار سلیقہ مند آدمی۔ ایسا کہ جہاں کہیں بھی ہو۔ جس وقت بھی، ماحول میں ان کی باتیں خوشبو کی طرح پھیلتی رہتیں۔

ان نادر انسانوں میں سے ایک جن کا خاندان فقط بہن بھائی فرزند اور بیٹیاں ہی نہیں ہوتیں۔ صرف وہی ان کے پسماندگان نہیں ہوتے۔ ایسا آدمی جس کا کوئی بدل نہیں ہوتا۔ ہزاروں اور لاکھوں لوگ جسے روتے ہیں۔ ایسی ہی ایک شخص پر مولانا ظفر علی خاں نے کہا تھا: آج بھی گریہ نہیں کرنا ہے تو یہ توفیق اللہ نے آدمی کو بخشی ہی کیوں تھی۔ بعض اوصاف مرنے والے کے ایسے تھے کہ کبھی کسی اور میں نہ دیکھے۔ شاعر نے کہا تھا:

وہ اعتبار ہے مجھ کو سرشت انساں پر
کسی بھی شہر میں جاؤں غریب شہر نہیں

اپنائیت کا ایسا پیکر۔ کوئی بھی شخص، اللہ کا کوئی بھی بندہ اس کے لئے اجنبی نہ تھا۔ نظر اٹھا کر دیکھتے اور آنکھیں چمک اٹھتیں۔ پھر وہ ان کا ہو جاتا۔ وہ اس کے ہو جاتے۔ ملک بھر کے کتنے ہی شہروں میں ہزاروں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اس کے خاص دوست ہیں۔ اس کی ہم دم اور ہم ساز ہیں۔

شاعر نے شکوہ کیا تھا:

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

وہ ہر ایک کے چارہ ساز اور غم گسار تھے۔ کوئی ذات پات، کوئی قوم قبیلہ، کوئی خاص مکتب فکر نہ جماعت، وہ سبھی کے تھے۔

لگ بھگ 29 برس ہوتے ہیں نواز شریف نے روزنامہ جنگ کے دفاتر پہ پولیس چڑھا دی کہ کاغذ پرنٹنگ پریس تک پہنچ نہ سکے۔ مرحوم سے میر شکیل الرحمان نے کہا: چار صفحات چھاپ دیجیے۔" چاریوں پورے بارہ صفحات" اس نے کہا اور شب بھر اس کے لئے جاگتے رہے۔ نجم سیٹھی کے گرد اسی شریف نے گھیرا تنگ کیا۔ وہ قاضی حسین احمد مرحوم کے پاس پہنچے۔ ایسے میں ہمیشہ اسی آدمی کو یاد کیا جاتا۔ خوش دلی سے وہ ہنستا اور خوشی سے فرض نبھاتا۔ زندگی اس کے لئے الفاظ نہیں عمل میں تھی۔

ممتاز، اخبار نویس عدنان عادل کرونا میں اس شدت سے مبتلا ہوئے کہ پھیپھڑے مجروح ہو گئے۔ انہی کو فون کیا۔ اول انہوں نے برادر خورد کو ذمہ داری سونپی۔ کچھ دیر میں خیال آیا کہ معاملہ معمول کا نہیں چنانچہ ایک مشہور Chest specialist کو فون کیا۔ وہ سرتاپا مصروف۔ مگر امیر العظیم کی بات کون ٹال سکتا تھا۔ انہی دنوں خاکسار بھی کرونا میں مبتلا ہوا۔ رات دس بجے نشر ہونے والا پروگرام میری ذمہ داری تھی۔ یہ ناچیز اور ایک خاتون میزبان۔ موضوعات کے درمیان ربط قائم کرنے میں، اپنا ثانی نہ رکھتی تھی۔ عدنان عادل بروقت نوٹس لکھا دیتے۔ کچھ ترتیب۔ کسی شعر، کسی حکایت کسی تشبیہ کا اضافہ۔ میرے لئے تو یہ تعطیل ہوگئی

ٹالسٹائی نے کہا تھا: لکھنے والا وہ ہے کہ جو اس پر بیتے، ایسے موزوں الفاظ میں کہہ ڈالے کہ پورا تاثر قاری تک من وعن منتقل ہو جائے۔ ذہن مگر مباحثے میں جاگتا ہے۔ سب بھولا بسرا یاد آنے لگتا ہے۔ ٹیلی فون پہ بھی کوئی ٹی وی پروگرام ہوا کرتا ہے؟ رحمت کردگار سب کچھ بھی ممکن ہے۔

ان دنوں امیر العظیم سے بات ہوتی تو حوصلہ افزائی کرتے۔ دوسرے سیاسی لیڈروں کے برعکس کبھی کوئی فرمائش نہ کی۔ تیس چالیس برس میں صرف ایک بار کوئی عنوان تجویز کیا۔ بات ہوئی تو ایسی معصومیت سے جو بچوں کا شیوہ ہے یہ۔ کہا: کالم تو ٹھیک مگر تمہید کی ضرورت کیا تھی؟ ایسا آدمی ہی یہ بات کہہ سکتا ہے جس کا باطن ریا سے پاک ہو۔ عمر فاروق اعظمؓ کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان کا باطن ان کے ظاہر سے زیادہ اجلا ہے۔ سب اہل بیت اور سب اصحاب رسول ایسے ہی تھے۔ تن من کے اجلے۔ امیر العظیم مسلمان تھے۔ ہر ایک کے خیر خواہ۔۔۔ سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصحاب کے درمیان تشریف فرما تھے کہ آنکھیں بھر آئیں۔ فدا کاروں کی زبانیں گنگ، چہروں پہ سناٹا۔" کیا کوئی گستاخی سرزد ہوگئی"۔۔۔ فرمایا: میں نے انہیں یاد کیا جو بعد میں آئیں گے مگر مجھ سے اتنی محبت کریں گے جتنی تم کرتے ہو، حالانکہ مجھے دیکھا نہ ہوگا۔ خواہش اور دعا یہ ہے کہ امیر العظیم کو پروردگار اپنے انہی خاص بندوں میں شامل فرمالے۔

دوسرے سیاسی لیڈروں کے برعکس کبھی کوئی فرمائش نہ کی۔ تیس چالیس برس میں صرف ایک بار کوئی عنوان تجویز کیا۔ بات ہوئی تو ایسی معصومیت سے جو بچوں کا شیوہ ہے یہ۔ کہا: کالم تو ٹھیک مگر تمہید کی ضرورت کیا تھی؟ ایسا آدمی ہی یہ بات کہہ سکتا ہے جس کا باطن ریا سے پاک ہو۔ عمر فاروق اعظمؓ کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان کا باطن ان کے ظاہر سے زیادہ اجلا ہے۔ سب اہل بیت اور سب اصحاب رسول ایسے ہی تھے۔ تن من کے اجلے۔

امیر العظیم منصورہ کی بستی کا دھڑکتا ہوا دل

افشاں نوید

کچھ لوگ رخصت ہوتے ہیں تو ایک شخص دنیا سے جاتا ہے، کچھ لوگ رخصت ہوتے ہیں تو ایک عہد ختم ہو جاتا ہے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے جانے کے بعد بھی ان کی آوازیں، ان کے قدموں کی چاپ، ان کے جملے، ان کے فیصلے اور ان کی محبتیں دیر تک لوگوں کے درمیان زندہ رہتی ہیں۔ امیر العظیم ایسے ہی تھے۔ منصورہ لاہور میں ان کی نمازِ جنازہ ادا ہوئی تو شاید بہت سے لوگوں کے دل میں یہی احساس تھا کہ آج ہم صرف ایک رہنما کو نہیں، اپنے ایک ایسے ساتھی کو رخصت کرنے آئے ہیں جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ایک مقدس مقصد کے نام کر دیا تھا۔ وہ جماعت اسلامی کے مرکزی سیکریٹری جنرل تھے، لیکن ان کی اصل پہچان کوئی منصب نہیں تھا۔ وہ ایک کارکن تھے، ایک نظریاتی انسان تھے، ایک عاشق مشن تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا تعارف یہ تھا کہ انہوں نے جو کچھ مانا، اسی کے مطابق جئے...... جس مقصد کو حق سمجھا، اس کے لیے کھڑے رہے...... اور جس راستے کو اختیار کیا، اس پر آخری سانس تک چلتے رہے۔ ان کی زندگی کا سفر نوجوانی سے شروع ہوتا ہے۔

جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ کے زمانے میں وہ ایک پُر جوش نوجوان رہنما تھے۔ ان کے لہجے میں ایسی گرج تھی کہ مخالفین بھی چونک جاتے۔ ان کی آواز میں وہ اعتماد تھا جو کسی وقتی جوش سے پیدا نہیں ہوتا، بلکہ کسی پختہ یقین سے جنم لیتا ہے۔ وہ نعرے لگاتے تھے: "سبز ہے، سبز ہے، ایشیا سبز ہے!" اور دوسری طرف سے آواز آتی: "سرخ ہے، سرخ ہے، رشیا سرخ ہے!" یہ صرف نعروں کی جنگ نہیں تھی۔ یہ دو مختلف نظریات کے درمیان کشمکش تھی۔ یہ اُس زمانے کی فکری اور نظریاتی جنگ تھی جس میں نوجوانوں کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ کس فکر کے ساتھ کھڑے ہوں گے، کس تہذیب کو اپنا مستقبل بنائیں گے، کس نظریے کو دل میں جگہ دیں گے۔

امیر العظیم نے یہ انتخاب بہت پہلے کر لیا تھا۔ انہوں نے زندگی بھر اس انتخاب کو نہیں بدلا۔ وہ نوجوانی کے ان نعروں کو عمر کے ساتھ بھول جانے والوں میں سے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی جوانی کے جوش کو پختہ عمر کی بصیرت میں ڈھالا اور پھر اس بصیرت کو زندگی بھر کی جدوجہد بنا دیا۔ وہ سبز اور سرخ کی کشمکش کو صرف ایک سیاسی یا وقتی معرکہ نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ حق اور باطل، ایمان اور الحاد، اسلامی تہذیب اور مغربی غلبے کے درمیان ایک مسلسل معرکہ تھا...... اور وہ اس معرکے کے تماشائی نہیں تھے۔ وہ تماشائی بن کر زندگی گزارنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ اگر حق کو حق سمجھ لیا ہے تو پھر اس کے لیے کھڑا ہونا ہوگا۔ اگر کسی مقصد کو درست مانا ہے تو پھر اس کی قیمت بھی ادا کرنا ہوگی۔ اگر کسی راستے کو منزل سمجھا ہے تو پھر اس راستے کی دشواریوں سے گھبرانا نہیں ہوگا۔ ایک آگ کا دریا ہے اور تیر کے جانا ہے۔ انہوں نے اس آگ کے دریا میں صرف خود تیر کر نہیں دکھایا، دوسروں کو بھی تیرنا سکھایا۔ ان کی زندگی ایک مسلسل حرکت تھی۔ ایک لمحے کے لیے چین سے بیٹھنا ان کے مزاج میں نہیں تھا۔ تنظیمی کام، سیاسی جدوجہد، کارکنوں سے رابطے، اجتماعات، سفر، تحریکی ذمہ داریاں، فکری گفتگو، تحریر، تقریر...... وہ ہر میدان میں متحرک تھے۔ بیماری نے جسم کو کمزور کیا، لیکن ارادے کو نہیں۔ کینسر جیسی موذی بیماری نے پندرہ برس سے زیادہ ان کے جسم کو گھیرے رکھا، مگر ان کے عزم کو شکست نہ دے سکی۔ وہ علاج بھی کراتے رہے، ذمہ داریاں بھی نبھاتے رہے، سفر بھی کرتے رہے اور اپنے مشن سے جڑے کام بھی کرتے رہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب جماعت اسلامی کے نئے امیر حافظ نعیم الرحمٰن نے منصورہ میں مرکزی شوریٰ کے اجلاس کے دوران اپنی ٹیم کا اعلان کیا اور امیر العظیم صاحب کے پاس مائیک آیا تو...... جماعت اسلامی میں تنظیمی ذمہ داری سے رسمی طور پر معذرت معمول کی روایت نہیں۔ لیکن امیر العظیم نے معذرت کی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے زندگی میں کبھی کسی تنظیمی ذمہ داری سے معذرت نہیں کی، لیکن میری صحت آپ کے سامنے ہے۔ مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں، جن کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔ پھر انہوں نے وضاحت کی کہ یہ ضروری کام کسی جائیداد یا کاروبار سے متعلق نہیں۔ کچھ یادیں ہیں جنہیں لکھنا ہے۔ کچھ ادھورے لکھے ہوئے کام ہیں جنہیں مکمل کرنا ہے۔ اس کے لیے انہیں کچھ وقت چاہیے۔ ایک ایسی زندگی چاہیے جو تنظیمی ذمہ داریوں کے بوجھ سے کچھ آزاد ہو، تاکہ وہ اپنے ان ادھورے کاموں کو تکمیل تک پہنچا سکیں۔ یہ کیسی معذرت تھی۔ ایک شخص جو پوری زندگی تحریک کے لیے کھڑا رہا، وہ اپنے لیے کچھ فرصت مانگ رہا تھا، مگر اپنی جائیداد سنبھالنے کے لیے نہیں۔ اپنے کاروبار کے لیے نہیں۔ اپنی ذات کے لیے نہیں۔ وہ اپنی یادیں لکھنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے کچھ بکھرے ہوئے اوراق مکمل کرنا چاہتا تھا۔ وہ آنے والی نسلوں سے کچھ محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ امیر جماعت نے ان کی بات سن کر فرمایا: "ہم نے آپ کی بات سن لی ہے۔ اللہ آپ کے وقت اور عمر میں برکت دے گا، لیکن اس وقت آپ ہی اس ذمہ داری کے لیے اہل تر ہیں۔ فی الحال

"آپ کی معذرت قبول نہیں کی جاسکتی۔" یہ جملہ مکمل ہوا تو امیر العظیم نے حلف پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ حلف جو انہوں نے زندگی میں کتنی ہی بار اٹھایا تھا۔ لیکن حلف اٹھانا ایک بات ہے اور حلف کو نبھانا دوسری بات۔ ذمہ داری قبول کرنا ایک بات ہے اور اس ذمہ داری کے لیے اپنی ذات کو کھپا دینا دوسری بات۔ کسی مشن سے وابستہ ہونا ایک بات ہے اور اس مشن کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی ترجیح بنا دینا دوسری بات۔

امیر العظیم صرف وابستہ نہیں تھے۔ وہ فدا تھے۔ انہوں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ جماعت اسلامی کو کتنی نشستیں ملیں، کتنی حکومتیں بنیں، کتنے انتخابات جیتے یا ہارے۔ وہ اس سے بہت بلند تھے۔ ان کے لیے اصل سوال یہ تھا کہ ہم نے اپنا فرض ادا کیا یا نہیں؟ ہم چلتے رہے یا رک گئے؟ ہم نے حق کی گواہی دی یا خاموش رہے؟ ہم نے آنے والی نسلوں کے لیے کچھ چھوڑا یا نہیں؟ ان کے نزدیک سفر کی کامیابی کا پیمانہ منزل کا مل جانا نہیں تھا۔ یہاں عین منزل ہے سفر کا دشوار ہو جانا۔ یہاں چلتے رہنا ہی اصل کامیابی ہے۔ منزل کب ملے گی، کس کو ملے گی، کتنے عرصے بعد ملے گی...... یہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ انسان کا کام چلتے رہنا ہے۔ امیر العظیم چلتے رہے۔ اور صرف خود نہیں چلے...... لوگوں کو ساتھ لے کر چلے۔ نوجوانوں کو اپنے ساتھ جوڑا۔ کارکنوں کو حوصلہ دیا۔ مایوس لوگوں کو امید دی۔ تنظیم کے اندر آنے والوں کو یہ احساس دیا کہ وہ کسی اجنبی جگہ نہیں، اپنے گھر میں آئے ہیں۔ منصورہ ان کے لیے صرف جماعت اسلامی کا مرکزی دفتر نہیں تھا۔ وہ منصورہ کی بستی میں دل بن کر دھڑکتے تھے۔ ایک ساتھی نے کہا: "یہ تصور کرنا ہی دشوار تر ہے کہ ہم منصورہ جائیں اور وہ منصورہ امیر العظیم کے بغیر ہو۔" واقعی! کچھ لوگ کسی جگہ کا حصہ نہیں ہوتے، وہ خود اس جگہ کی شناخت بن جاتے ہیں۔ منصورہ میں امیر العظیم صرف ایک عہدیدار نہیں تھے۔ وہ اس بستی کی رونق تھے۔ کارکنوں کی آوازوں میں ان کی آواز شامل تھی۔ راہ داریوں میں ان کے قدموں کی چاپ تھی۔ اجتماعات میں ان کی گرج تھی۔ گفتگو میں ان کی بے تکلفی تھی۔ اور نہ جانے کتنے لوگوں کے لیے ان کا گھر ایک پناہ گاہ تھا۔

کل ہی ایک بھائی کا تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ وہ اپنے بچے کے علاج کے لیے لاہور آئے تھے۔ علاج طویل تھا۔ شاید دو سال بھی لگ سکتے تھے۔ امیر العظیم نے اپنے گھر کا نچلا پورا حصہ ان کے لیے پیش کر دیا۔ اس بھائی نے شاید کہا کہ علاج میں دو سال لگ سکتے ہیں۔ امیر العظیم نے بے نیازی سے جواب دیا: "تو رہیے دو سال، کون منع کر رہا ہے؟ یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔" یہ صرف ایک گھر کا نچلا پورشن کسی کو دے دینا نہیں تھا۔ یہ اس دل کا پتا تھا جس میں اپنے لوگوں کے لیے جگہ تھی۔ بہت جگہ تھی۔ ایسی جگہ جو کرائے کے معاہدوں سے نہیں، محبت کے رشتوں سے بنتی ہے۔ یہی تو مشن سے محبت ہے۔ دراصل مشن سے محبت صرف نظریے سے محبت نہیں ہوتی۔ اس مشن سے وابستہ انسانوں سے بھی محبت کرتا ہے۔ وہ ان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتا ہے۔ ان کی پریشانی میں کھڑا ہوتا ہے۔ ان کے بچوں کو اپنا بچہ سمجھتا ہے۔ ان کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہے۔ اور یہی

> امیر العظیم صرف وابستہ نہیں تھے۔ وہ فدا تھے۔ انہوں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ جماعت اسلامی کو کتنی نشستیں ملیں، کتنی حکومتیں بنیں، کتنے انتخابات جیتے یا ہارے۔ وہ اس سے بہت بلند تھے۔ ان کے لیے اصل سوال یہ تھا کہ ہم نے اپنا فرض ادا کیا یا نہیں؟ ہم چلتے رہے یا رک گئے؟ ہم نے حق کی گواہی دی یا خاموش رہے؟ ہم نے آنے والی نسلوں کے لیے کچھ چھوڑا یا نہیں؟ ان کے نزدیک سفر کی کامیابی کا پیمانہ منزل کا مل جانا نہیں تھا۔ یہاں عین منزل ہے سفر کا دشوار ہو جانا۔ یہاں چلتے رہنا ہی اصل کامیابی ہے۔

وجہ ہے کہ امیر العظیم کے جانے کے بعد بہت سی ذاتی یادیں سامنے آرہی ہیں۔ ہر شخص کے پاس ان کے بارے میں ایک الگ کہانی ہے۔ کسی کو یاد ہے کہ انہوں نے مشکل وقت میں ہاتھ تھاما تھا۔ کسی کی مالی مدد کی تھی۔ کسی نوجوان کی صلاحیت پہچانی تھی۔ کسی مایوس کارکن کو دوبارہ کھڑا کیا تھا۔ کسی کی بات گھنٹوں بیٹھ کر سنی تھی۔ یہی کسی انسان کی اصل میراث ہوتی ہے۔

جائیدادیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ عہدے ختم ہو جاتے ہیں۔ دفتر بدل جاتے ہیں۔ لیکن لوگوں کے دلوں میں محفوظ محبتیں باقی رہتی ہیں۔ امیر العظیم نے اپنے خاندان کو بھی اسی مشن کے لیے تیار کیا۔ انہوں نے صرف خود مشنری زندگی نہیں گزاری، اپنے گھر کو بھی ایک نظریے سے جوڑے رکھا۔ ان کے لیے گھر اور مشن دو الگ دنیائیں نہیں تھیں۔ ان کی ذات میں دونوں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔ ان کے اہلِ خانہ نے ان کی مصروفیات دیکھیں، ان کے سفر دیکھے، ان کی بیماری دیکھی، ان کی تھکن دیکھی، لیکن یہ بھی دیکھا کہ ایک انسان اپنے مقصد کے ساتھ کس طرح وفادار رہتا ہے۔ انہوں نے اپنے گھر والوں کو صرف یہ نہیں بتایا کہ مشن کیا ہے۔ انہوں نے انہیں دکھایا کہ مشن کے ساتھ جینا کیا ہوتا ہے۔ اپنا گھر، اپنا مال، اپنا وقت، اپنی صلاحیتیں...... انہوں نے سب کچھ اس مقدس مقصد پر نچھاور کر دیا۔ یہ فدائیت آسان نہیں ہوتی۔ نوجوانی میں انقلاب کے نعرے لگانا آسان ہوتا ہے۔ جوانی کے جوش میں جلسے جلوسوں میں کھڑے ہونا آسان ہوتا ہے۔ مگر پھر عمر کے ساتھ ساتھ جب زندگی کی سہولتیں اپنی طرف بلائیں، جب ذاتی مصروفیات بڑھ جائیں، جب صحت کمزور ہونے لگے، جب جسم ساتھ نہ دے، تب بھی اسی راستے پر کھڑے رہنا...... یہ اصل امتحان ہے۔ امیر العظیم نے یہ امتحان دیا۔ اور اپنی پوری زندگی سے اس کا جواب لکھا۔ انہوں نے اپنی جوانی کا جوش بھی دیا۔ اپنی جوانی کے بعد کی پختگی بھی دی۔ اپنی صحت بھی دی۔ اپنی توانائی بھی دی۔ اپنا مال بھی دیا۔ اپنا گھر بھی دیا۔ اور آخر میں اپنی بیماری کے باوجود وقت بھی دیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی موت کا غم صرف اس لیے نہیں کہ ایک بڑا رہنما چلا گیا۔ غم اس لیے بھی ہے کہ ایک ایسا شخص چلا گیا جو اپنے وجود سے لوگوں کو یقین دلاتا تھا کہ ابھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو مقصد کے لیے جیتے ہیں۔ جو اپنی ذات سے بلند ہو سکتے ہیں۔ جو اپنے آرام کو قربان کر سکتے ہیں۔ جو اپنے حصے کا چراغ دوسروں کے لیے جلا سکتے ہیں۔ امیر العظیم کی آواز میں گرج مگر ان کے دل میں نرمی تھی۔ وہ مخالف کے سامنے ایک مضبوط نظریاتی سپاہی تھے، مگر اپنے کارکن کے سامنے ایک شفیق ساتھی۔ وہ میدان میں للکار سکتے تھے، لیکن گھر کی دہلیز پر آنے والے پریشان انسان کے لیے اپنے دروازے کھول سکتے تھے۔ وہ نظریے پر سمجھوتا نہیں کرتے تھے، لیکن انسانوں کے دکھ کو سمجھتے تھے۔ یہ امتزاج ہر کسی کے حصے میں نہیں آتا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے چاہنے والے ان کی آواز کو صرف جلسوں کے نعروں میں نہیں، اپنے دل کی دھڑکنوں میں محسوس کرتے ہیں۔ منصورہ کی بستی شاید اب بھی وہی

ہے۔وہی راستے ہیں۔ وہی عمارتیں ہیں۔ وہی دفتر ہیں۔ وہی کارکن ہیں۔وہی اجتماعات ہوں گے۔وہی اجلاس ہوں گے۔وہی قافلے آئیں گے اور جائیں گے......لیکن ایک آواز کم ہوگئی ہے۔ ان کے قدموں کی چاپ خاموش ہوگئی ہے۔ایک ایسا شخص جو منصورہ میں دل بن کر دھڑکتا تھا،اب نظروں سے اوجھل ہے۔مگر دل کی دھڑکنیں آنکھوں سے نہیں دیکھی جاتیں۔وہ محسوس کی جاتی ہیں۔اور امیر العظیم کے چاہنے والے شاید آج بھی ان دھڑکنوں کو سن سکتے ہیں۔ان کے لیے یہ منصورہ کبھی امیر العظیم کے بغیر نہیں ہوگا۔کیونکہ کچھ لوگ جگہوں سے چلے جاتے ہیں،لیکن جگہیں ان سے خالی نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے پیچھے اپنی روح چھوڑ جاتے ہیں۔ امیر العظیم نے بھی منصورہ میں اپنی روح کا ایک حصہ چھوڑا ہے۔ان کی تقریریں شاید دوبارہ سنائی جائیں گی۔ان کے جملے دہرائے جائیں گے۔ ان کے واقعات سنائے جائیں گے۔ نوجوانوں کو بتایا جائے گا کہ ایک شخص تھا جس نے جوانی میں نعرے لگائے تھے،مگر عمر بھر ان نعروں کی قیمت ادا کی۔ایک شخص تھا جس نے کہا تھا کہ زندگی حق کے ساتھ گزارنی ہے،تماشائی بن کر نہیں۔ پھر اس نے اپنی زندگی سے ثابت کر دیا کہ وہ تماشائی نہیں تھا۔وہ میدان کا آدمی تھا۔وہ صفِ اول کا سپاہی تھا۔وہ قافلے کا مسافر تھا۔وہ مشن کا عاشق تھا۔اور وہ آخری وقت تک چلتا رہا۔شاید اس کی زندگی کا سب سے خوب صورت پہلو یہی ہے کہ اس نے نوجوانی کے جذبات کو بڑھاپے کی تھکن کے حوالے نہیں کیا۔اس نے اپنے خوابوں کو حقیقت کی سختیوں سے ٹوٹنے نہیں دیا۔ اس نے اپنی فکر کو حالات کے بدلنے سے نہیں بدلا۔اس نے اپنی وفاداری کو کامیابی اور ناکامی کے پیمانے سے نہیں ناپا۔اس نے صرف یہ دیکھا کہ راستہ درست ہے یا نہیں۔ اور جب اسے یقین ہوگیا کہ راستہ درست ہے تو پھر وہ چل پڑا۔وہ چلتا رہا۔پھر دوسروں کو ساتھ ملاتا رہا۔پھر ایک دن خود رخصت ہوگیا۔لیکن جاتے جاتے ایک سوال چھوڑ گیا: ہم نے اپنے حصے کا سفر کتنا طے کیا؟ ہم نے اپنے مشن کے لیے کیا قربانی دی؟ ہم نے اپنے مقصد کو اپنی زندگی میں کتنی جگہ دی؟ ہم نے اپنے بچوں کو کیا سکھایا؟ ہم نے اپنے بعد آنے والوں کے لیے کیا چھوڑا؟ اور اگر کبھی زندگی ہمیں کسی موڑ پر روک کر پوچھے کہ تم تماشائی تھے یا قافلے کے ساتھ چلنے والے؟ تو

ہمارے پاس کیا جواب ہوگا؟ امیر العظیم کے پاس جواب تھا۔ان کی پوری زندگی جواب تھی۔انہوں نے کہا نہیں، کر کے دکھایا۔انہوں نے مشن کو صرف زبان سے نہیں اپنایا، زندگی سے اپنایا۔انہوں نے حلف صرف پڑھا نہیں، نبھایا۔انہوں نے محبت صرف بیان نہیں کی، بانٹی۔انہوں نے کارکن صرف گنے نہیں، سنبھالے۔انہوں نے نظریہ صرف سمجھا نہیں، جیا۔اور انہوں نے اپنی زندگی کے آخری باب تک یہ ثابت کیا کہ ایک انسان اگر اپنے مقصد کے ساتھ مخلص ہو تو اس کی عمر ختم ہو سکتی ہے، اس کا سفر ختم ہو سکتا ہے، لیکن اس کی جدو جہد ختم نہیں ہوتی۔ وہ دوسروں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جاتی ہے۔وہ نئی نسلوں کے قدموں میں چلنے لگتی ہے۔وہ نئے دلوں میں دھڑکنے لگتی ہے۔آج امیر العظیم ہم میں نہیں ہیں، لیکن ان کے بعد بھی راستہ باقی ہے۔مشن باقی ہے۔قافلہ باقی ہے، اور وہ لوگ بھی باقی ہیں جنہیں انہوں نے اپنے ساتھ چلنا سکھایا۔

یہی ان کی اصل کامیابی ہے۔انسان فانی ہے۔عہدے فانی ہیں۔شہرت فانی ہے۔جسم فانی ہے۔لیکن حق کے لیے اخلاص سے اٹھایا ہوا قدم، اللہ کی رضا کے لیے دی ہوئی قربانی، انسانوں کے دل میں پیدا کی ہوئی محبت، اور کسی صالح مقصد کے لیے وقف کی ہوئی زندگی......یہ سب اپنی گواہی چھوڑ جاتے ہیں۔امیر العظیم بھی اپنی گواہی چھوڑ گئے ہیں۔وہ گواہی جو اُن کے ساتھی دیں گے۔ وہ گواہی جو اُن کے کارکن دیں گے۔وہ گواہی جو اُن کے اہلِ خانہ دیں گے۔وہ گواہی جو اُن کے گھر کے دروازے سے فائدہ اٹھانے والے وہ لوگ دیں گے جنہیں انہوں نے اپنے گھر کا حصہ دے دیا تھا۔وہ گواہی جو منصورہ کی دیواریں دیں گی۔اور شاید سب سے بڑھ کر وہ گواہی جو اُن کا رب دے گا، جس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی کا سودا کیا۔ہم نہیں جانتے کہ اللہ کے ہاں اُن کے لیے کیا مقام لکھا گیا ہے،لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ ایک

ایسی زندگی جو حق کے لیے گزری، جس میں ذاتی آرام سے زیادہ مقصد عزیز رہا، جس میں اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کی فکر رہی، جس میں بیماری بھی عزم کو شکست نہ دے سکی، ایسی زندگی خالی نہیں جاتی۔ایسے لوگ مر کر بھی اپنے مشن میں زندہ رہتے ہیں۔اور شاید یہی وہ امر ہونا ہے جس کی طرف امیر العظیم اپنی پوری زندگی بڑھتے رہے۔امر فرد نہیں ہوتا، امر اس کا مشن ہوتا ہے۔فرد چلا جاتا ہے، مشن چلتا رہتا ہے۔آواز خاموش ہو جاتی ہے، پیغام باقی رہتا ہے۔ قدم رک جاتے ہیں، قافلہ آگے بڑھتا ہے۔اور منصورہ کی بستی میں، جہاں کبھی ایک شخص دل بن کر دھڑکتا تھا، شاید اب وہ دھڑکن بہت سے دلوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔وہ نوجوان جو آج نعرہ لگائے گا، اسے شاید معلوم نہ ہو کہ یہ نعرہ کبھی ایک نوجوان امیر العظیم کی آواز میں بھی گونجا تھا۔وہ کارکن جو آج کسی مشکل میں بھی کھڑا رہے گا، شاید اسے معلوم نہ ہو کہ کبھی ایک شخص نے اسی طرح نصف صدی تک چل کر دکھایا تھا۔وہ خاندان جو اپنے گھر کا دروازہ کسی ضرورت مند کے لیے کھولے گا، شاید اسے معلوم نہ ہو کہ اس روایت کی ایک روشن مثال امیر العظیم نے بھی اپنے پیچھے چھوڑی ہے۔اور وہ شخص جو کبھی سوچے گا کہ ایک آگ کا دریا ہے، اس میں تیر کر جانا ہے، تو شاید اسے دور کہیں ایک آواز سنائی دے: تماشائی بن کر نہیں، حق کے ساتھ چلنا ہے......اور چلتے رہنا ہے۔یہی امیر العظیم کی زندگی کا سبق ہے۔یہی ان کی میراث ہے۔یہی ان کے لیے سب سے بڑا خراجِ عقیدت ہے کہ ہم ان کی یاد میں صرف آنسو نہ بہائیں، بلکہ ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔کہ ہم اپنے حصے کا سفر طے کریں۔اپنا عہد نبھائیں۔اپنی ذمہ داری پوری کریں۔اپنے مشن سے وفا کریں۔اور جب زندگی کا سفر اختتام کو پہنچے تو ہمارے پیچھے بھی کوئی یہ کہنے والا ہو: وہ شخص تماشائی بن کر نہیں جیا تھا۔وہ حق کا علم تھام کر چلا تھا۔وہ آگ کے دریا میں اترا تھا۔اور تیر کر پار ہوگیا۔اللہ تعالیٰ امیر العظیم مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، ان کی تمام دینی، تحریکی، تنظیمی اور انسانی خدمات کو شرفِ قبول عطا فرمائے، ان کے اہلِ خانہ اور تمام رفقا کو صبر جمیل دے اور ان کے چھوڑے ہوئے قافلے کو اخلاص، استقامت اور باہمی محبت کے ساتھ آگے بڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

ضلع ڈوڈہ میں بھارتی فوج کی ظالمانہ کارروائی، ایک نوجوان شہید، پورا علاقہ سراپا احتجاج

مقبوضہ کشمیر کے مختلف علاقوں میں بھارتی فوج و پولیس کے بڑے پیمانے پر محاصرے اور چھاپے

3500 سے زائد کشمیری نوجوان گرفتار، متعدد جائیدادیں ضبط

ہمایوں قیصر

17 جولائی 2026۔۔۔ سرینگر کے علاقے میں انسداد منشیات کی آڑ میں بھارتی حکام نے عدنان لطیف شیخ، دانیال احمد، شاہد گل اور عادل احمد میر کے رہائشی مکانات سمیت متعدد کروڑوں مالیت کی جائیدادیں ضبط کر لی ہیں۔ بدنام زمانہ بھارتی تحقیقاتی ادارے نیشنل انویسٹی گیشن ایجنسی کی ایک خصوصی عدالت نے ایک جھوٹے مقدمے میں زیر حراست 10 کشمیریوں روبینہ نذیر ملک، اشفاق احمد میر، مدثر احمد پسوال، محفوظ احمد مغل، محمد راشد ٹھاکر، محمد ریاض لوہار، جاوید اقبال ٹھاکر، عبدالرشید میر، عبدالرشید بٹ اور بشارت علی پسوال کے خلاف فرد جرم عائد کی ہے۔ جبکہ دیگر ملزمان میں صغیر احمد پسوال،، طارق احمد ملک، الف الدین بڈانہ، مشتاق احمد نائیک فردوس احمد ڈار اور مشتاق احمد ملک بھی شامل ہیں۔ یاد رہے مشتاق احمد ڈار چند برس پہلے ایک معرکہ میں بھارتی فوج کے ساتھ لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔

18 جولائی 2026۔۔۔ ضلع ڈوڈہ کے علاقے بھدرواہ کے علاقے میں بھارتی فوج نے ایک ظالمانہ کارروائی کے دوران جعلی مقابلے میں نوجوان عارف حسین کو اندھادھند فائرنگ کر کے شہید کیا ہے۔ عارف حسین کے بہیمانہ قتل کیخلاف علاقے میں زبردست احتجاجی مظاہرے کیے گئے۔ بھدرواہ جامع مسجد کے باہر سینکڑوں لوگوں نے جمع ہو کر احتجاجی مظاہرہ کیا اور قابض بھارتی انتظامیہ کے خلاف نعرے بازی کی۔ بھارتی پولیس کے ایک افسر نے دعویٰ کیا ہے کہ علاقے میں فائرنگ کے واقعے میں تین پولیس اہلکار بھی زخمی ہوئے ہیں۔ ضلع پلوامہ کے علاقے سانبورہ میں بھارتی فوج نے محاصرے اور تلاشی کی ایک کارروائی کے دوران گھروں میں گھس کر تلاشی لی، مکینوں کو ہراساں کیا، گھریلو سامان کی توڑ پھوڑ کی، نقدی سمیت قیمتی سامان بھی لوٹ لیا۔ بھارتی فوج نے کم از کم چھ خواتین کے ساتھ بدسلوکی کی اور انہیں تشدد کا نشانہ جس کے نتیجے میں شدید وہ زخمی ہوئیں۔ ضلع جموں میں ضلعی انتظامیہ اور پولیس کی مشترکہ ٹیم نے انسداد منشیات کی آڑ میں تعمیر شدہ مزید دو افراد کے مکانات کو مسمار کیے جبکہ ضلع سانبہ میں بڑی برہمنہ کے علاقے اپر بلولے میں ایک جائیداد ضبط کر لی ہے۔

20 جولائی 2026۔۔۔ ضلع کپواڑہ کے لولاب علاقے میں بھارتی فوج نے ایک ظالمانہ مہم کے دوران عوام پر سخت پابندیاں عائد کرتے ہوئے قریبی جنگلات میں جانور چرانے، جڑی بوٹیاں اور سبزیاں جمع کرنے سے روک دیا ہے، بھارتی فوج کے اس اقدام سے پوری وادی لولاب میں خوف وہراس پھیل گیا ہے۔

22 جولائی 2026۔۔۔ ضلع اسلام آباد کے علاقے لال چوک میں محاصرے کے دوران ایک نامعلوم شخص نے ہیڈ کانسٹیبل عاشق حسین پر قریب سے گولیاں چلادیں جس کے نتیجے میں وہ موقعہ پر ہی ہلاک ہوگیا۔ ضلع گاندربل کے علاقے وائل میں ایک 25 سالہ شخص اپنی رہائش گاہ پر پراسرار حالت میں مردہ پایا گیا جس کی شناخت فرحان احمد خان کے طور پر کی گئی ہے۔

23 جولائی 2026۔۔۔ ضلع راجوری سندر بنی سیکٹر میں بھارتی فوج کا ایک اہلکار سکھپریت سنگھ ڈیوٹی کے دوران پھسل کر گہری کھائی میں جا گرا جس کے نتیجے میں وہ موقعہ پر ہی ہلاک ہوگیا۔ بھارتی فوج نے ایک ظالمانہ کارروائی کے دوران ضلع اسلام آباد کے علاقے بیج بہاڑہ میں مجاہد عادل احمد ٹھوکر ساکن بجبہاڑہ اور ہارون گنائی ساکن حسن پورہ کے مکانات کو بارود لگا کر تباہ کر دیا۔ دونوں مجاہدین کے گھر 2025 میں بھی بھارتی فوج نے ایک مہم کے دوران چند برس پہلے مسمار کیے تھے، ان دوبارہ تعمیر شدہ مکانات کو بارود سے اڑا کر فوج نے ظلم و جبر کی نئی داستان رقم کر دی ہے۔ ضلع کولگام میں ایک پولیس اہلکار کی ہلاکت کے بعد حملہ آوروں کو گرفتار کرنے کے آڑ میں اجتماعی سزا کے طور پر قابض فوج نے مختلف علاقوں میں چھاپوں کے دوران 3500 کے لگ بھگ بے گناہ نوجوانوں گرفتار کر کے وادی کے مختلف جیلوں میں منتقل کر دیا ہے۔

24 جولائی 2026۔۔۔ مقبوضہ وادی میں بھارتی پولیس نے ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے سابق صدر میاں عبدالقیوم، سابق نائب صدر ایڈووکیٹ اعجاز بیدار، ایڈووکیٹ جی این شاہین اور مرحوم ایڈووکیٹ بلال احمد بٹ کے خلاف درج ایک جھوٹے مقدمے میں سرینگر کی این آئی اے عدالت میں چارج شیٹ پیش کی ہے۔

25 جولائی 2026۔۔۔ ضلع سرینگر میں بھارتی پولیس نے این آئی اے کے ہمراہ کالے قانون کے تحت ایک چھاپے کے دوران حیدر پورہ کے علاقے پیر باغ میں عاقب فاروق کا ایک دو منزلہ رہائشی مکان، اندر ہامہ بٹہ پورہ میں اذان پرویز ساکن رعناواری کا ایک منزلہ رہائشی مکان اور صورہ میں مبشر احمد حکیم کی 12 مرلے اراضی

کے ساتھ ایک دومنزلہ رہائشی مکان کو بھی ضبط کرلیا ہے۔

27 جولائی 2026--- ضلع کپواڑہ کے ہندواڑہ قصبے میں بھارتی فوج کا ایک ہیڈ کانسٹیبل شیو کمار ڈیوٹی کے دوران اچانک بے ہوش ہونے کے بعد چل بسا۔

28 جولائی 2026--- ضلع بارہمولہ کے اوڑی کے کمل کوٹ علاقے میں اپر گڑھ فارورڈ پوسٹ کے قریب ایک دھماکہ ہوا جس کے نتیجے میں بھارتی فوج کے دو اہلکار دفادار وجے کمار اور نائیک شرانا پا انگاری زخمی ہو گئے۔ضلع گاندربل کے کنگن علاقے میں یاتریوں کی ایک بس تیز رفتاری کے باعث سڑک سے پھسل کر ایک مکان پر جا گری جس کے نتیجے میں کم از کم 39 ہندو امرناتھ یاتری زخمی ہو گئے۔ضلع شوپیاں کے علاقے زینہ پورہ میں وچی روڈ پر ایک سڑک حادثے کے دوران بھارتی فوج کی ایک گاڑی الٹ گئی جس کے نتیجے میں 11 اہلکار زخمی ہو گئے ہیں۔

29 جولائی 2026--- ضلع بڈگام کے شیخ پورہ علاقے میں بھارتی فوج کی ایک گاڑی چنار کے درخت سے ٹکرا گئی جس کے نتیجے میں تین فوجی اہلکار زخمی ہوئے۔

30 جولائی 2026--- ضلع رام بن کے علاقوں کندن کھاری، کوٹ کھاری اور بانہال میں بھارتی انتظامیہ نے ایک کارروائی کے دوران غلام رسول، عبداللطیف نائیک، عبدالرشید اور مشتاق احمد کی اراضی کالے قانون کے تحت ضبط کر دی ہے۔

یکم اگست 2026--- ضلع کولگام کے علاقے کیلم میں نامعلوم مسلح افراد کی فائرنگ سے دو غیر ریاستی باشندے دیپک راترے اور بوپندر کمار ہلاک ہو گئے ہیں۔

2 اگست 2026--- ضلع بارہمولہ کے علاقے میں شیری گوری وان کراسنگ پر محاصرے اور تلاشی کی ایک مشترکہ کارروائی کے دوران بھارتی فوج نے ایک نوجوان اعجاز احمد گنائی کو مجاہدین کا معاون قرار دے کر گرفتار کرلیا اور اس کے قبضے سے اسلحہ اور گولہ بارود برآمد کرنے کا دعویٰ کیا۔

3 اگست 2026--- ضلع پلوامہ کے علاقے پچار فروٹ منڈی کے قریب محاصرے اور تلاشی کی ایک کارروائی کے دوران بھارتی پولیس نے ایک عام شہری توفیق احمد ڈار کو گرفتار کرلیا۔گرفتاری کا جواز پیش کرنے کے لئے بھارتی فوج نے اس کے قبضے سے پوسٹر اور ایک دستی بم برآمد کرنے کا دعویٰ کیا۔جموں کے اکھنور کے علاقے فارورڈ جوگوان میں ڈیوٹی کے دوران ایک بھارتی فوجی کی سروس رائفل سے غلطی سے گولی چلنے سے وہ موقعہ پر ہی ہلاک ہوگیا۔ضلع بارہمولہ میں سوپور کے علاقے ڈانگر پورہ میں ایک نوجوان پراسرار حالت میں مردہ پایا گیا۔

4 اگست 2026--- ضلع کپواڑہ کے علاقے ہندواڑہ ماور میں ایک بھارتی پولیس افسر اسسٹنٹ سب انسپکٹر ڈیوٹی کے دوران گر کر ہلاک ہوگیا۔

6 اگست 2026--- ضلع پونچھ کے مینڈھر سیکٹر کے کنگا گلی میں کنٹرول لائن کے قریب بارودی سرنگ کے دھماکے میں گشت کے دوران بھارتی فوج کے دو اہلکار زخمی ہو گئے۔

7 اگست 2026--- ضلع بارہمولہ کے علاقے سوپور ہردوشیوا میں ایک نوجوان کو پراسرار طور پر مردہ پایا گیا۔

8 اگست 2026--- بھارتی پولیس کے خصوصی ونگ "کاؤنٹر انٹیلی جنس کشمیر" نے وادی کے متعدد علاقوں میں فوجی اہلکاروں کے ہمراہ گھروں پر چھاپے مارے اور تلاشی کی کارروائیاں عمل میں لائیں اس دوران خواتین اور بچوں سمیت مکینوں کو سخت ہراساں کیا گیا، اراضی اور دیگر جائیدادوں کی ضروری دستاویزت، لیب ٹاپ، موبائل فون اور دیگر ڈیجیٹل آلات ضبط کیے گئے اور قیمتی گھریلو اشیاء کی توڑ پھوڑ کی گئی۔

9 اگست 2026--- بھارتی فوج اور تحقیقاتی ایجنسیوں کی متعدد ٹیموں نے ضلع بارہمولہ میں سوپور اور ملحقہ علاقوں میں بڑے پیمانے پر کالے قانون کے تحت درج ایک جھوٹے کیس کے سلسلے میں 26 مقامات پر جماعت اسلامی کے کارکنوں کے گھروں میں گھس کر تلاشیاں لیں اور مکینوں کو ہراساں کیا۔بھارتی پولیس نے بڈگام کے ارچندرہما، ماگام میں سراج نبی کو سوشل میڈیا پر ایک پوسٹ شیئر کرنے پر گرفتار کر کے عدالتی حراست میں سینٹرل جیل سرینگر بھیج دیا گیا۔

11 اگست 2026--- سرینگر کی ایک عدالت نے کشمیری نوجوان غلام محی الدین کو 2020 کے ایک جھوٹے مقدمے میں عمر قید کی سزا سنائی ہے۔ بھارتی پولیس کا الزام تھا کہ غلام محی الدین تحریک المجاہدین کے بانی ارکان میں شامل تھا۔

13 اگست 2026--- ضلع پونچھ کے علاقے مینڈھر میں عسکری گروپ کے ساتھ وابستہ ہونے کے الزام میں بدنام زمانہ بھارتی تحقیقاتی ادارے نیشنل انویسٹی گیشن ایجنسی کی خصوصی عدالت نے ایک آزادی پسند کشمیری نثار احمد جو 2012 سے قید ہیں کو 14 برس قید کی سزا سنائی ہے۔

14 اگست 2026--- ضلع ادھمپور کے علاقے مونگری پانچیری میں بھارتی فوج کی سرپرستی میں قائم ویلیج ڈیفنس گارڈز کے ایک رکن نے فائرنگ کر کے اپنے ہی ساتھی بلد یو سنگھ کو ہلاک اور دوسرے ساتھی کاومیش سنگھ کو شدید زخمی کر دیا۔

15 اگست 2026--- بھارتی انتظامیہ نے ایک جھوٹے الزام میں ضلع بڈگام کے علاقے خانصاحب میں محمد رفیق خان نامی کشمیری کی ایک دکان اور سروس سٹیشن ضبط کرلیا۔

ایک باوقار سپاہی رُخصت ہوا

سیف اللہ خالد (نائب امیر حزب)

جماعت اسلامی پاکستان کے سینئر رہنما اور سیکرٹری جنرل امیر العظیم صاحب کے انتقال کی خبر نے پوری قوم کو غمزدہ کر دیا ہے۔امیر العظیم صاحب ایک ایسا نام تھا جو وقار، سادگی اور نظریاتی پختگی کی علامت تھا۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی اسلام کے غلبے اور پاکستان میں عدل و انصاف کے قیام اور تحریک آزادی کشمیر کے لیے وقف کر دی۔ طالبعلمی کے زمانے سے لے کر جماعت کے اعلیٰ ترین عہدے تک، ان کا سفر قربانی، محنت اور استقامت کی مثال ہے۔ اصولوں پر سمجھوتہ نہ کرنا، دلیل سے بات کرنا اور مخالف کو بھی عزت دینا ان کا طرہ امتیاز تھا۔ان کا سب سے بڑا سرمایہ ان کا کردار تھا۔ان کے جانے سے جماعت نے ایک مخلص کارکن، ملت نے ایک سچا رہنما اور سیاست نے ایک باوقار انسان کھو دیا ہے۔یہ وہی امیر بھائی تھے جو ہر کارکن کے لیے دروازہ کھلا رکھتے تھے۔ جن کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ اور زبان پر امت کا درد۔وہ لیڈر نہیں، استاد تھے۔انہوں نے سکھایا کہ سیاست عبادت بھی ہو سکتی ہے۔اقتدار کے بغیر بھی اصولوں پر جیا جا سکتا ہے۔ شور کے بغیر بھی کام کیا جا سکتا ہے۔وہ آخری سانس تک جماعت کے لیے جئے۔اسپتال کے بستر پر بھی ملک و ملت کا سوچتے رہے۔امیر بھائی، آپ نے وعدہ نبھا دیا۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کا دیا ہوا مشعلِ راہ بجھنے نہیں دیں گے۔بہت سے لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ لیکن کچھ نام کردار کی وجہ سے یاد رہتے ہیں۔امیر العظیم صاحب انہی میں سے تھے۔انہوں نے ثابت کیا کہ خلوص اور استقامت کے ساتھ بھی عوامی خدمت ممکن ہے۔ ۔امیر العظیم صاحب کا جانا ملت مظلومہ کشمیر اور پاکستان کے لیے بڑا نقصان ہے، لیکن ان کی میراث ہمارے لیے مشن ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ انکے درجات بلند فرمائیں۔آمین

Kashmir-ul-Youm Regd. No.885—Mails. B/NPR-234

پلاؤ کباب
SavourFoods®
a tasteful choice

Savour Krispo | Savour Ice Cream | Savour Beverages

DOWNLOAD THE APP NOW

Download on the App Store | ANDROID APP ON Google play

سیور، پاکستان کا Favourite پلاؤ!

#PAKISTANKAFAVOURITEPULAO

RAWALPINDI
- GORDON COLLEGE ROAD
- PINDI CRICKET STADIUM
- GHAZNI MARKET, BAGH SARDARAN
- PESHAWAR ROAD RWP. CANTT

ISLAMABAD
- BLUE AREA
- MELODY FOOD PARK
- MAIN P.W.D ROAD
- PLOT 05 BAHRIA TOWN PHASE VII

LAHORE
- SHAMA CHOWK FEROZEPUR ROAD
- MCLEOD ROAD LAKSHAMI CHOWK
- NEAR SAFARI ZOO, RAIWIND ROAD
- KHUDA BAKHSH COLONY, GHAZI ROAD

WAH CANTT.
- G.T ROAD BAHTER MORR.

SAVOURFOODS.COM.PK | savourfoods | UAN 051 111 728 687